اسلامی نظام حکومت میں، ووٹر بننے کے لئے نہ کسی خاص محکمہ میں اپنے کو پیش کرنے کی ضرورت، نہ ووٹ دینے کے لئے کسی تعلیم کی، کسی تعداد آمدنی کی، کسی خاص اہلیت کی حاجت، نہ مرد و عورت کی کوئی تفریق، نہ نمائندوں کے انتخاب کا کوئی جھگڑا نہ انتخابات کی مہم پر لاکھوں کا خرچ، نہ کونسل ہال کی تعمیر کے لئے اینٹ اور چونے پر لگانے کے لیے دولتِ قارون کی احتیاج، نہ عمر کی قید نہ رنگ کی، نہ وطن کا امتیاز نہ نسل و قوم کا، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے قطعاً بے نیازی۔ شرط او رصرف ایک ہی شرط کلمہ گو ہونے کی! جس انسانی ہستی نے جہاں اور جس وقت بھی کلمۂ شہادت کی تصدیق کی معاً وہیں، وہ مجلس شوریٰ کا ممبر بغیر کسی ضابطہ پُری کے، بغیر کسی فیس کے، بغیر کسی درد سر کے، ہوگیا، اور اسی وقت سے اسے امیر و خلیفہ کی رائے کے مقابلہ میں اپنی آزادانہ رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہوگیا، نہ اُسے اس کی حاجت، کہ کوئی اس کا انتخاب کرے، نہ اسے اس کا انتظار، کہ پارلیمنٹ یا کونسل کے اجلاس کا وقت آئے، نہ اُس کے لیے یہ مرحلہ کہ وہ حکومت کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھائے۔ اُس کا مسلم ہونا، مترادف ہے، اُس کے رکن مجلس شوریٰ ہونے کے!

فرانس کی حریت نوازی کا غلغلہ آج ساری دنیا میں بلند ہے، دنیائے تہذیب میں فرانس اور آزادی کے ایک ہی معنی سمجھے جاتے ہیں، لیکن خود دختران فرانس آج تک ووٹ کے لئے چلّا رہی ہیں، اور ایوان حکومت سے یہ کہہ کہہ کر اپنا سر ٹکرا رہی ہیں، کہ آخر ہم بیچاریوں کو محض عورت ہونے کے جرم میں کیوں ممبری سے محروم کر دیا گیا ہے؟ (بای ذنب قتلت) یہ نمونہ ہے مغرب کی جمہوریت کا! اس کے مقابلہ میں خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ کو ان کے اجلال فاروقی سے مرعوب و متاثر نہ ہوکر، جو آواز سر منبر ٹوکتی ہے، اور بغیر "امیر المومنین" "خلیفہ رسول اللہ" "یور مجسٹی" "یور ایکسلنسی" "یور لارڈشپ" وغیرہ کے مصنوعی القاب تعظیم، استعمال کیے ہوئے، بغیر پورا نام مبارک بھی لئے ہوئے، بلکہ محض "ابن خطاب" (اے خطاب کے لڑکے) کہہ کر پکارتی ہے، وہ ایک معمولی بوڑھی عورت کے گلے سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے! اور وہ آواز ایسی

موثر ثابت ہوتی ہے، کہ رسول خدا کا یہ جلیل القدر رفیق صحبت، عراق و شام کا فاتح، قیصر وکسریٰ کے سر پُر غرور کو کچلنے والا معاً اعتراض کو تسلیم کرکے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتا ہے! یہ نمونہ تھا، اسلام کی شوریت کا!

اسلامی مجلس شوریٰ کے لیے کسی عالیشان عمارت کی ضرورت نہیں۔ ہر مسجد کا صحن اور دالان دار الشوریٰ ہے۔ نمائندوں اور انتخاب کی ضرورت نہیں، ہر کلمہ گو ووٹر ہے، اجلاس شوریٰ کے لیے ہفتوں اور مہینوں کے انتظار کی حاجت نہیں، بلا ناغہ ہر روز پانچ مرتبہ اس کے اجلاس ہو سکتے ہیں، اور ضرورت ہو تو امیر مجلس کے وقت کا ہر لمحہ اس کے لیے وقف ہو سکتا ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنا ووٹ دے بھی، بڑی آبادیوں میں ایسا ہونا شائد ممکن بھی نہیں، لیکن یہاں سوال عملاً ووٹ دینے کا نہیں بلکہ ووٹ کے حق کا ہے، اور یہ حق، ہر کلمہ گو کو اسی لمحہ سے حاصل ہو جاتا ہے، جب سے وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔

حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ کی تقریریں اور خطبات جن میں بار بار اس قسم کے اعلانات ملتے ہیں، کہ

اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔ جب تک میں خدا اور رسول کی اطاعت کروں تم بھی میری اطاعت کرو، اور جب میں ان کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت نہ کرو یا یہ کہ

اما انا ومالکم کولی الیتیم۔ مجھے تمھارے مال میں (یعنی سرکاری خزانہ میں) بس اسی قدر حق حاصل ہے، جتنا یتیم کے ولی کو یتیم کے مال میں ہوتا ہے۔ سو ان تمام موقعوں پر خطاب، اپنے ہمسر و ہم چشم چند رفیقوں کی جانب نہیں ہوتا تھا، بلکہ عامۂ مسلمین کی ساری اسلامی آبادی کی جانب ہوتا تھا، اور بعض خطبات میں تو اس سے بھی ترقی کرکے 'ایھا الناس' کا لفظ موجود ہے۔ یہ اگر اسلامی شوریت کا احساس نہیں تھا، تو پھر آخر کیا تھا؟

احساس شوریت جب تک زندہ رہا ہر قدم مشورت کے سایہ میں اٹھتا رہا

اور علماء تصریح کرتے رہے، کہ

قال ابن خواز منداد واجب علی الولاۃ مشاورۃ العلماء فی ما لا یعلمون وفی ما اشکل علیھم من امور الدنیا ومشاورۃ وجوہ الجیش فی ما یتعلق بالحروب وجوہ الناس فیما یتعلق بالمصالح ووجوہ الکتاب والعمال والوزراء فیما یتعلق بمصالح البلاد وعمارتھا (فتح البیان جلد ۲)

حاکموں پر، عالموں سے اُس چیز میں مشورہ کرنا جو اُن کے علم میں نہ ہو، یا جو امر انھیں مشکل معلوم ہو، اور سرداران فوج سے امور جنگ میں مشورہ کرنا، اور سرداران قوم سے مصالح ملکی میں مشورہ کرنا، اور افسروں، عہدہ داروں، اور وزیروں سے شہروں کے معاملات میں مشورہ کرتے رہنا واجب ہے۔

اسی قدر نہیں، بلکہ یہ اعلان حق ہوتا رہا، کہ

حکی قرطبی عن ابن عطیۃ انہ لا خلاف فی وجوب عزل من لا یستشیر اھل العلم والدین (فتح البیان جلد ۲)

جیسا قرطبی نے ابن عطیہ سے روایت کی ہے، جو امیر اہل علم و دین سے مشورہ نہ کرتا رہے اُس کی معزولی کے واجب ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

گویا، دوسرے الفاظ میں، وہ شخص بذات خود کتنا ہی صاحب علم، صاحب عقل، صاحب تقویٰ ہو، اگر قانون شوریت کا پابند نہیں، تو اُسے مرتبۂ حکومت سے معزول کر دینا، جائز ہی نہیں، واجب ہے۔

دنیا کی وہ سب سے بڑی ہستی، جس کی نظیر خالق السموات والارض نے نہ آج تک پیدا کی، اور نہ آئندہ پیدا ہونے کو ممکن بتایا ہے، یہی نہیں کہ شوریت کی سب سے بڑی مبلغ رہی ہے۔

اما ان اللہ ورسولہ یغنیان عنھا ولکن اللہ جعلھا رحمۃ لامتی فمن استشار من امتی لم یعدم رشداً ومن ترکھا لم یعدم غیاً (فتح البیان جلد ۲)

اللہ اور اس کا رسول، مشورہ سے بے نیاز ہیں لیکن اللہ اسے بطور رحمت میری امت کے لیے کر دیا ہے، میری امت والے جب تک مشورہ پر قایم رہیں گے راہ راست پر رہیں گے اور جب مشورہ چھوڑ دیں گے، بھٹک کر رہیں گے۔

ما شاور قوم قط الاھدا والارشد امورھم (ابن جریر، جلد ۴)

ہر قوم جب تک مشورت پر قایم رہی، ہدایت کے بہترین راستہ پر قایم رہی بلکہ وہ ذات اقدس، باوجود ہر انسانی رائے ومشورہ سے بے نیاز ہونے کے خود ہی سب سے زیادہ کثیر المشاورۃ، سب سے زیادہ قانون شوریت پر عمل کرنے والی گذری ہے۔

عن عایشۃ انھا قالت ما رائت رجلا اکثر استشارۃ للرجال من رسول اللہ صلعم (معالم التنزیل بغوی تفسیر آیہ شاورہم فی الامر)

حضرت عایشہؓ فرماتی ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر کسی کو لوگوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

تہذیب لندن کی کہانی

ایک لندنی کی زبانی

لندن، تہذیب و تمدن کا مرکز، تعلیم و شائستگی کا گہوارہ، اور علوم و فنون کا مخزن ہے عقل سلیم کہتی ہے کہ اگر وہاں بھی اندھیرا ہوا، تو روشنی کی تلاش کہاں کی جائے گی؟ لیکن یہ سن کر، اور وہ بھی ایک انگریز کی زبان سے آپ کو حیرت ہوگی، کہ خود برطانوی پولیس کے پاس جو نقشہ ہے اُس میں مخدرات (نشلی دواؤں مثلاً افیون، کوکین، وغیرہ کی خفیہ فروشی کے جو خاص مرکز دیے ہوئے ہیں اُن میں

"لیورپول، سوتھمپٹن اور گلاسگو کے ساتھ لندن بھی ہے" (ص۱۶۱)

یہ بیان کسی دشمن برطانیہ کا نہیں، خود لندن ہی کے ایک معزز اہل قلم مسٹر ٹیلر کرافٹ کا ہے، جن کی کتاب (Cloven Hoof) کے نام سے ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب ناول یا افسانہ نہیں اور نہ برطانیہ کو بدنام کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ ایک سنجیدہ تبصرہ شہر لندن کی اخلاقی پستیوں پر ہے، اور مصنف کا مقصود خیرخواہی کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کو اُن خطرات سے آگاہ کردینا ہے ضخامت ۲۷۱ صفحہ۔ قیمت ½۷ شلنگ، اور ناشر (Denisarcher) ۶۔ اولڈ گلوسسٹر اسٹریٹ۔ لندن۔ ہم آپ بھی لندن کی سرسری سیر اسی قابل اعتماد روشنی میں کرسکتے ہیں۔

"صاحب لوگوں" کی شراب خواری سے سب واقف ہیں، لیکن یہ دوسرے قسم کے نشے تو مشرق ہی کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ بیان بالا سن کر قدرۃً حیرت ہوتی ہے، اور اس حیرت میں ترقی یہ سن کر ہوتی ہے، کہ یہ مرض ملک میں اندر ہی اندر پھیلا ہوا ہے، پولیس کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے پاتی، چنانچہ سنہ ۳۳ء میں اس جرم کی علت میں گرفتاریاں کل ۶۵ ہوئیں، اور مصنف کو لکھنا پڑا، کہ

"جرم اور انکشافِ جرم کے درمیان عدم مناسبت حیرت انگیز ہے" ص۲۷

(عام کسبیوں اور بیسواؤں کا پیشہ ہماری آپ کی نظر میں جیسا ذلیل ہے ظاہر ہے) لندن شہر میں عام بے عصمتی سے قطع نظر کرکے ان مخصوص پیشہ وروں کی تعداد ۴۰ ہزار ہے (ص۲۹) یہ وہ ہیں، جو باضابطہ لائیسنس لئے ہوئے علانیہ اور خالصتًا اسی پیشے کو کر رہی ہیں، اور ہندوستان کی بیسواؤں کی طرح گانے، بجانے، ناچنے وغیرہ کی آڑ نہیں رکھتیں! اور تعداد تو خیر یہ ہے ہی "کمیت" سے بڑھ کر "کیفیت" درد انگیز ہے، یونان قدیم میں اس طبقہ کی عورتیں نفاست و شائستگی کی تصویر سمجھی جاتی تھیں، اور خود لکھنؤ میں بھی شاہی زمانہ میں اونچی طوائفیں راس قابل تھیں، کہ اچھے اچھے امیر زادے، شائستگی، تمیز داری، اور خوش سلیقگی کی تربیت حاصل کرنے کو ان کی خدمت میں بھیجے جایا کرتے تھے۔ لندنی بیسوا بیچاری ان اوصاف سے بھی تہی دامن ہے۔ اس کے محبوب مشاغل علاوہ اپنی عصمت فروشی کے یہ ہیں۔

"نشیلی دواؤں کا استعمال، شرفا کو دھمکا کر ان سے روپیہ وصول کرنا، مخبری کرنا، ناجائز شراب کی تجارت پر کمیشن وصول کرنا، اور جیب کاٹ لینا! بیسوا ہونا اور جرایم پیشہ ہونا کچھ اس طرح لازم و ملزوم ہو گیا ہے، کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہے" ص۲۹

اور اس اجمال کی تفصیل مصنف اپنے معتبر معلومات، اکثر ذاتی علم سے، دس بارہ صفحہ میں کرتا ہے

جوئے کی جو جو "لطیف" نادر اور مخفی شکلیں، انگریزی عہد حکومت کے ساتھ ہی

ہندوستان میں رائج ہوگئی ہیں گھوڑ دوڑ کا جوا، اور لاٹری، اور کارنیوال، اور بیمہ کمپنی، اور خدا علوم اور کیا کیا اس کے لحاظ سے، اعتراف ذیل، توعین توقع کے مطابق ہے:۔

"انگریزوں کا من حیث القوم جواری ہونا تو ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میرے خیال میں، اگر قمار بازی کو معصیت قرار دیا جائے، تو ہر انگریز اس میں اپنی توہین سمجھے اور اُسے غصہ آجائے" (ص ۴۲)

تاہم ان حدود کا جو اقتباس ذیل سے ظاہر ہوتے ہیں، گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ گھر کے بھید، تو گھر کے بھیدی ہی کی زبان سے کھل سکتے ہیں۔

"تمام قوموں میں ہم ہی ایسے ہیں، جن کے ہاں بجز اتوار کے دن اور گڈ فرائیڈے اور بڑے دن کے گھوڑ دوڑ سال بھر برابر ہر روز ہوتی رہتی ہے اور اس موقع پر جو بازیاں لگتی ہیں، چاہے وہ کتنی ہی قیود و شرائط کے ساتھ ہوں سب کہیں سے زیادہ کھل کر لگتی ہیں۔ یہ مشغلہ ہماری قوم کے ہر طبقہ کا جزو زندگی بن گیا ہے، انگریز چاہے کیسا ہی کسی کام میں لگا ہوا ہو، کیسا ہی اُس کا دل پھنسا ہوا ہو، کیسا ہی غریب و مفلس ہو، لیکن بازی لگانے سے کبھی نہ باز آئے گا، اس کے لئے پیسہ اور وقت ضرور نکال لے گا۔ قانون نے جو کچھ تھوڑی سے روک تھام کر دی ہے، وہ گویا سمندِ شوق پر تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ تھوڑی بہت ضد اور ہٹ اور قانون شکنی کی ہمت ہم سب میں رہتی ہے۔ اور پھر اگر یہ خفیف روک تھام ہٹا لی جائے، تو ہمارے ہزارہا ہزار ہم قوم بے معاش اور بے روزگار ہو جائیں خاص شہر لندن میں کوئی ایک لاکھ افراد تو ضرور ایسے نکلیں گے، علاوہ باضابطہ دلّالوں اور اُن کے عملہ والوں کے، جن کا ذریعہ معاش یہی ہے" (ص ۴۳، ۴۵)

نشہ بازی، پیشۂ حرام کاری، اور قمار بازی کے ان مناظر کے بعد، ان سے بھی افسوس ناک تر ابواب پیش نظر ہوتے ہیں، اور وہ شہوت پرستی کے دوسرے اصناف سے متعلق ہیں لندن کی سی گھنی اور وسیع آبادی کے اندر ان امراض کا نفس وجود باعث حیرت نہیں،

بدمعاش اور اوباش کہاں اور کس سوسائٹی میں نہیں ہوتے؟ لیکن مصنف کے بیان سے تو یہ انکشاف ہوتا ہے، کہ اس بدمعاشی میں بھی ایک خاص نظم و انتظام موجود ہے مردوں کی طرف میل رکھنے والے مردوں کے باضابطہ کلب ہیں، سوسائٹیاں ہیں، اور ان کے ارکان اور ان کے سرپرست، بازار کے شہدے اور لفنگے نہیں، بلکہ

"اسکولوں کے ماسٹر، گرجوں کے پادری، اور اسکاوٹ ماسٹر حضرات ہیں۔ یہ لوگ اپنے مرتبہ اور اقتدار سے فائدہ اٹھا کر کمسن لڑکوں کو پھانستے رہتے ہیں" صفحہ ٦

یہ حال مردانہ سوسائٹی کا ہوا۔ صنف نسواں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ جو عورتیں عورتوں کی طرف میل رکھتی ہیں، وہ بدبختی سے، سب سے زیادہ تختۂ مشق، اپنی قریب ترین عزیز عورتوں ہی کو بناتی رہتی ہیں، اور ایسیوں کی تعداد خطرناک حد تک زائد ہے (صفحہ ٤٢) غیر طبعی شہوت رانی کے یہ دو طریقے بہرحال متعارف و معروف ہیں لیکن شیطنت کچھ انھیں دو طریقوں پر بند نہیں۔ یہ بھوت جب انسان پر سوار ہوتا ہے تو خدا معلوم ذہن کہاں کہاں پہونچ جاتا ہے، چنانچہ لندن والوں نے اسی معتبر لندن والے کے حسب بیان عجب عجب صورتیں ایجاد کر رکھی ہیں، جن میں سے بعض نہایت ہی درجہ نفرت انگیز ہیں، اور ناقابل ذکر تو سب کی سب۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ حقیقت بھی آشکار ہو کر رہی ہے، کہ

"یہ تو عرصہ سے معلوم و معروف تھا، کہ لندن میں خاص انھیں اغراض کے پورا کرنے کے لئے مستقل عمارتیں موجود ہیں، لیکن حال میں ایک مقدمہ کے دوران میں اس کا علم ساری پبلک کو بھی ہو گیا ہے" صفحہ ٩٦

خواہش نفسانی کے پورا کرنے کے لئے، بجائے انسان کے جانور کا استعمال ایک ایسی حیوانیت ہے، جس کے تصور ہی سے مذاق سلیم کو استفراغ ہونے لگتا ہے، لیکن تہذیب و تمدن کے عجائب زار میں ایسے ایسے درندے اور بہائم بھی انسان کی صورت میں موجود ہیں۔ مصنف کا بیان ہے کہ یہ خاص گندگی۔

"فاعلی حیثیت سے مَردوں میں تو شاذونادر ہی ہے، لیکن متعدد ڈاکٹروں نے، جن میں سے دو کی پریکٹس اعلیٰ امیر گھرانوں میں ہے مجھ سے زور دے کر بیان کیا کہ اس کا وجود صنف نسواں کے اعلیٰ طبقہ میں ہے، جو ایک خاص قسم کے کتّے اس غرض سے پالے رہتی ہیں" (ص۱۰۱) جن ڈاکٹر دوستوں نے مجھ سے یہ بیان کیا، اُنھوں نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ کتّے باوجود ایک مخصوص قسم کے ..... رکھنے کے اس طرح سدھائے جا سکتے ہیں، کہ عورت کی خواہش نفسانی کو پورا کر سکیں۔ اور ہائیڈ پارک کے قریب تو ایک کتّا خانہ خاص اسی غرض سے ایک عورت نے کھول رکھا تھا، جس میں وہ کتّوں کو اسی کے لئے سدھاتی تھی۔ پولیس کو معلوم نہیں اس کا پتہ چلا یا نہیں، لیکن اب وہ کارخانہ ٹوٹ چکا ہے" (ص۱۰۲)

انسانیت کی توہین و تذلیل کی کوئی صورت اس سے بڑھ کر خیال میں بھی نہیں آسکتی!

فحش کاری کی ان انتہائی پستیوں کے بعد، فحش نگاری اور فحش تصویروں، فحش تماشوں کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ جنھیں عملاً ان گندگیوں سے احتراز نہیں، اُنھیں ان کی نقل و عکاسی سے کیا احتیاط ہو سکتی ہے؟ نتیجہ قدرتاً یہ ہے کہ فحش کتابوں، فحش پوسٹ کارڈوں، فحش تصویروں کا دَور دَورہ ہے کتابیں جو اس صنف کی شائع ہوتی ہیں، اُنھیں یا تو کسی کی خود نوشت سوانح عمری سے موسوم کر دیا جاتا ہے، یا پھر اُن کا نام نیم طبّی یا نیم سائنٹیفک رکھ دیا جاتا ہے۔ بات دونوں صورتوں میں وہی، اور مغز دونوں قالبوں کے اندر ایک ہی ہوتا ہے۔ (ص۱۴۰) "نیم طبّی" اور "سائنٹیفک" کتابیں عموماً ان دوا فروشوں کے ہاں بکتی رہتی ہیں، جو "ضبط تولید" کی دواؤں اور آلات کا کاروبار کرتے رہتے ہیں، اور ڈاک کے ذریعہ سے بھی طبّی مشوروں کی آڑ میں، دھڑتے سے روانہ ہوتی رہتی ہیں۔ (ص۱۴۱)

یہ واضح رہے کہ کوئی اکہری تصویر، خواہ کیسی ہی بے پردہ و برہنہ ہو، انگلستان کے قانون میں ممنوع نہیں۔ جرم اور قانوناً فحش صرف وہ تصویریں قرار پائیں گی، جو دوہری ہوں، یعنی جن میں دو شخصوں کے درمیان کوئی بے حیائی کا عمل دکھایا گیا ہو مصنف کا بیان ہے کہ

"فحش تصویروں والے پوسٹ کارڈوں کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے، کارڈ اس آسانی سے، اور بعض اوقات اسی آزادی سے اِدھر سے اُدھر پھیل رہے ہیں، جیسے اخبارات ..... افسوس ہے کہ پچھلے سال دو سال میں یہ وُبا اور زیادہ پھیل گئی، خصوصاً لندن میں ..... اور دوسرے سودوں میں وہ نفع نہیں جو اس میں ہے" (صـ۱۴۲) اور ایسے ایسے لوگ اس آبادی میں موجود ہیں جو اپنی یہ تصویریں کھنچواتے ہیں، اُنھیں کھنچتے ہیں، اُنھیں چھاپتے ہیں، اور پھر اُن کی فروخت و اشاعت کرتے ہیں" (صـ۱۴۴)

گندگی و غلاظت کا جو مرقع ابھی آپ کی نظر سے گزرا، خوش نہ ہو جئے کہ آپ کے دشمن ان حرکتوں میں مبتلا ہیں۔ دشمن ہوں یا دوست، بہرحال انسان ہی ہیں انسانیت کی ان پستیوں پر ماتم کیجئے۔ اور ہو سکے تو ان غلط رو اور گمراہ بھائیوں اور بہنوں سے ہمدردی، موقع مسرت کا نہیں، رنج کا، اور وقت ہنسنے کا نہیں، رونے کا ہے۔ لیکن یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا ہے، کہ اتنا تنزل و تسفل بہ صورت ثبات عقل و ہوش ممکن کیوں کر ہے؟ یہ حالت تو طبیعی نہیں، بالکل غیر طبیعی ہے، صحت کی نہیں مرض کی ہے، مگر یہ غیر طبیعی حالت، یہ حالت مرض، کیوں کر وجود میں آئی؟

کل اسباب پر بحث، اور سب کا استقصاء، یہاں نہ مقصود ہے، اور نہ اتنی گنجائش میں ممکن۔ لیکن ایک بڑا سبب تو اس زوالِ عقل و زوالِ حیا کا شراب خانہ خراب ہے۔ مشرق نے اسی لئے اسے "اُم الخبائث" کہہ کر پکارا۔ یہ ایک خرابی، خدا جانے

ہی خرابیوں کی جڑ، یہ ایک بیاری خدا معلوم کتنی بیماریوں کا گھر ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے رند مشرب کا بیان ہے، کہ "ہم لوگ تخلیہ میں جو چاہیں کریں، لیکن اعلان کے ساتھ، سربازار، سربزم، ہم میں جو بڑے سے بڑے بے حیا ہیں، ان سے بھی بے حیائی، ممکن نہیں، برہنہ تصویر کھنچوانے وغیرہ کی کیفیت صرف شراب نوشی کا نتیجہ ہے، جس میں عقل بالکل زائل ہو چکتی ہے" اور عجب نہیں کہ یہی تشخیص صحیح ہو۔

مصنف نے کتاب کا ہر باب بہت بچ بچ کر لکھا ہے، اپنے ہم وطنوں کی طرف زیادہ سے زیادہ تاویلیں کی ہیں، لیکن مے خواری کے عنوان کے ماتحت وہ پوری صفائی کے ساتھ اعتراف و اقبال پر تل گیا ہے۔ کہتا ہے:۔

"مے نوشی کی معصیت اتنی قدیم ہے، اور شعر و ادب نے اسے اتنا رنگین بنا دیا ہے، کہ انگریزی قوم میں یہ عیب کوئی عیب نہیں رہا ہے، بلکہ لوگ اسے ہنر سمجھنے لگے ہیں، اور ایسا جو ہر کہ بغیر اس کے گویا مرد کی مردانگی میں فرق ہے۔ ترکِ مے نوشی کا وعظ مضحکہ خیز ہو گیا ہے، اور "اعتدال" کا نام لیتے ہی سالویشن آرمی کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے" (ص۱۴۱)، "شراب تقریباً ہم سب کے سب پیتے ہیں، اور ایک معنی کر کے بہت ہی زائد پیتے ہیں" ایضاً

جب عیب ہنر بن جائے اور بجائے شرمانے کے اُس پر فخر کیا جانے لگے، تو علاج کی کیا صورت، اور شفا کی کیا اُمید؟

"اس بیان پر چاہے ہنس لیا جائے۔ چاہے غصہ کیا جائے، چاہے اس کی تردید یا تضحیک کی جائے۔ لیکن حقیقت واقعہ یہی ہے کہ ہم شراب بہت ہی زائد پینے کے عادی ہیں۔ ہم خود بھی اسے محسوس کرتے ہیں، اور باہر والے بھی۔ ہماری قوم افیون، کوکین، وغیرہ کی چنداں شائق نہیں، اور دوسری یورپی قوموں کے مقابلہ میں کچھ ایسی بدچلن اور مسخ شدہ بھی نہیں، نہ ہم من حیث القوم جرائم خلاف وضع فطرت

کے دل دادہ ہیں، اور نہ ہمارے ہاں بیبوائیں بعض اُن ملکوں سے زائد
ہیں جن کی آبادی ہماری نصف ہے، لیکن سچائی سے بہت بعید ہے
اگر ہم اپنے شرابی ہونے کا انکار کریں" (صفحہ ۱۵۱)

لندن محض شرابی نہیں، شرابیوں کا سردار ہے۔ مصنف اپنا ذاتی
تجربہ بیان کرتا ہے :۔

"کولون (فرانس) یا بارسلون (اٹلی) میں ہوٹلوں میں کافی پی پی کر آدھی
آدھی رات گزاری جا سکتی ہے۔ اور میں نے گزاری ہے لیکن لندن
میں یہ ممکن نہیں۔ لندن میں ہر پارٹی کا مطالبہ شراب کا رہتا ہے
فلسفیانہ توجیہ اس کی جو کچھ بھی ہو، اور مطالبہ اُس کا پورا ہوتا رہتا
ہے" (۱۵۷)

ان بدمستیوں کے نتائج جو نکلنے تھے، نکل کر رہے۔ اور ان پر قلق و تأسف
ہم کو، آپ کو، ساری کائنات انسانی کو ہونا چاہیئے۔

تہذیب لندنی کا یہ خاکہ ایک دوست، ہواخواہ و ہمدرد کا کھینچا ہوا ہے
کیا ہماری عبرت اور نصیحت کے لیے اس کے اندر سامان موجود نہیں؟

پردہ کے حدود

سچ کے ایک ممتاز عنایت فرما، حیدرآباد دکن سے تحریر فرماتے ہیں:-

"ایک زمانہ سے ارادہ کر رہا ہوں کہ آپ سے عرض کروں، کہ پردہ کے مسئلہ پر توجہ فرمائی جائے۔ میری نالائقی مسلّمہ ہے۔ مکروہاتِ دنیوی کے ہجوم سے خود دریافت و تحقیق کی لیاقت نہ مہلت۔ آج کل عالم گیر خیال یہ پیدا ہو رہا ہے، کہ قرآن مبارک اور حدیث کی رو سے پردہ لازمی نہیں۔ اور امام غزالیؒ کے ارشاد کے بعد کہ الوجہ والکفان لاتدخل فی الستر۔ روشن خیال احباب کو گویا سند جواز مل گئی ہے ..... اس کی تشریح اور اس مسئلہ پر اگر آپ قلم اٹھائیں، تو بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی، اور میرے نزدیک اس مسئلہ پر لکھنے کی سخت ضرورت ہے رہا یہ کہ باعتبار معاشرت کس حد تک ہم کو پردہ اختیار کرنا چاہئیے تو احکام قرآن و احکام احادیث کے بعد یہ ضرورت خود بخود باقی نہ رہے گی۔"

یہ ایک خط صرف بطور نمونہ دے دیا گیا۔ ورنہ اس موضوع پر لکھنے کی فرمایش اور اصرار ہر طرف سے اور بہ کثرت ہو رہا ہے۔ ملکۂ افغانستان کے اظہار خیال کے بعد سے مختلف اخبارات میں سلسلۂ بحث چل نکلا ہے۔ بعض مضامین سچ میں نقل بھی ہو چکے ہیں، جن میں سے دو مضمون مشاہیر علماء وقت

سکے ہیں۔

جن عنایت فرما کا مراسلہ اوپر درج ہے ان کی تحریر میں اس موضوع پر اکثر دوسرے قلم اٹھانے والوں کی طرح کسی قدر غلط مبحث ہے۔ چہرہ اور کف دست کے داخل ستر نہ ہونے سے "بے پردگی" کی سند جواز کہاں سے مل جاتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ نتیجہ یہ نکلے گا، کہ یہ دونوں چیزیں پردہ کے حدود میں داخل نہیں۔ طبیب نے اگر مریض کو بعض غذاؤں کے کھانے کی اجازت دے دی ہے، تو اس کے یہ معنی تو نہیں، کہ مریض کے لئے اب کوئی پرہیز باقی نہیں رہا، اور ہر غذا کے لئے اُسے آزادی مل گئی ہے!

طبیب اگر مریض کو بعض غذاؤں سے روک دیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اُن غذاؤں کی ممانعت مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود اصلی مریض کی صحت ہے۔ اور چوں کہ طبیب کے علم و تجربہ میں بعض غذائیں اس مقصدِ صحت کے حصول میں روک پیدا کریں گی، اور ان کا ترک حصول صحت میں مُعین ہوگا، اس لئے وہ ان سے پرہیز کی ہدایت کرتا ہے طبیب روحانی کو بھی اسی طرح صحت روحانی مقصود ہوتی ہے، وہ پرہیز کراتا ہے تو صرف اُنھیں اعمال و اشغال سے جن سے صحت روحانی کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے پس مذہب کی عائد کی ہوئی قیدیں اور پابندیاں صرف دیکھنے میں سختیاں معلوم ہوتی ہیں، ورنہ درحقیقت انسان کے حق میں وہ عین سہولتیں اور نرمیاں، راحتیں اور رحمتیں ہوتی ہیں۔ پردہ بھی "قید" صرف اسی معنی میں ہے۔ مرد عورت کا باہمی میل جول ایک خاص حد کے اندر، دونوں کی تکمیل اور قوی اخلاقی کی نشو و نما کے لئے مفید ہے۔ اس حد کے اندر کوئی ٹوک نہیں۔ اس حد سے باہر قدم رکھنا اپنی فطرت و سیرت کی تکمیل میں خلل ڈالنا اور اپنی اخلاقی صحت کو نقصان پہنچانا ہے، اعضاء جسم کو کھولنا یا چھپانا بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ اسی مقصد کی ماتحتی میں ہے، اور اسی منظم طرز معاشرت کا نام پردہ ہے،

پردہ سے اصلی مقصود اُس جوہر اخلاق کی حفاظت ہے جو شرفِ انسانیت ہے یعنی حفظ عصمت۔ اور تمام تدبیریں جو مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہوں، سب

اسلامی پردہ کے حدود میں آجاتی ہیں۔ قرآن حکیم نے محض بدکاری ہی کو نہیں روکا ہے، بلکہ ہر وہ چیز جو اس جانب لے جائے، ناجائز و ممنوع ہے۔ لا تقربوا الزنا (بنی اسرائیل ع۴)[1] کا حکم نہایت عام و وسیع ہے "بدکاری" کے نزدیک نہ جاؤ۔" محض یہ ارشاد نہیں کہ "بدکاری نہ کرو" بلکہ اس کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔ یعنی اس کی نزدیکی بھی حرام، اور جو چیزیں بھی انسان کو اس کے قریب اور نزدیک لاتی ہیں، سب ناجائز۔ فحش راگ، فحش اشعار، فحش تذکرے فحش تصویریں، غرض ہر ایسی شئے جو اس راہ میں آسانیاں پیدا کرے، اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے ممنوع ٹھیرادی ہے۔ تفصیلات ہر قوم اور ہر زمانہ کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں، سب کا احاطہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اجمالی و اصولی حکم کے تحت میں سارے ذرائع آگئے۔ اب اگر کسی طبقہ یا گروہ کی اخلاقی و معاشری حالت اتنی پست و زبون ہوگئی ہے کہ اس میں کسی عورت کا چہرہ یا ہتھیلی کھل جانا ہی فتنہ کا سبب بن جاتا ہے، تو اس سوسائٹی کے اندر ان اعضا کا کھلنا بے شبہ جرم قرار پا جائے گا اور انھیں ڈھانپے رہنا اسی طرح لازمی ہوجائے گا جس طرح وہ دوسرے اعضا جن کے چھپانے کا حکم تصریح سے موجود ہے۔ رہا یہ امر کہ کس ملک اور کس قوم کی اخلاقی حالت اس کی متقاضی ہے، سو اس کا فیصلہ کرنا وہاں کے ارباب حل وعقد اور علماء متدین کا کام ہے۔ قرآن مجید نے صرف ایک عام اصول بتا دیا ہے۔

اس عام و اصولی حکم کے علاوہ، پردہ سے متعلق چند احکام تفصیل و تصریح کے ساتھ بھی کلام مجید میں وارد ہیں۔ ان سب سے اہم و مقدم ہدایت یہ ہے، کہ مرد اور عورتیں

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ..... وقل للمومنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن (نور - ع۴)

دونوں اپنی اپنی نظریں نیچی رکھا کریں، اور اپنی اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتی رہیں۔ گویا حفظ عصمت کے سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی یہی ہے، کہ مرد و عورت دونوں اپنی نظروں پر قابو حاصل کریں، اور انھیں نیچی رکھنے کی عادت ڈالیں۔ جو لوگ نفس بشری کے طریق کار سے واقف ہیں، یا نفسیات کا مطالعہ کرچکے ہیں، باآسانی

---

[1] لا تقربوا الزنا بالعزم والاتیان بالمقدمات، فضلاً عن ان تباشروہ (بیضاوی)

سمجھ سکتے ہیں، کہ بدنظری کی ممانعت، بدکاری سے روکنے میں کس بڑی حد تک معین ہو سکتی ہے"، اور جس نے اپنی نظر پر قابو حاصل کر لیا" اس کے لئے اپنے دل پر اور اپنے قوائے شہوانی پر قابو حاصل کر لینا کس قدر آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن نظر کے قابو میں رکھنے کے اس اہتمام و تاکید سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے، کہ عورت و مرد کے ملنے کی یکسر ممانعت شائد قرآن مجید کا مقصود نہ ہو۔ نظریں نیچی رکھنے کی ضرورت تو اسی وقت کے لئے ہے، جب دونوں جنسوں کا ایک دوسرے سے سامنا ہوتا رہے، جب سرے سے نظر پڑنے ہی کا امکان نہیں، تو اس حکم کے لئے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟

یہ حکم مردوں عورتوں دونوں کے لئے عام ہے۔ اس کے بعد دوسری ہدایت جو مخصوص عورتوں کے لئے ہے، یہ ہے کہ اپنی زینت نہ ظاہر ہونے دیں، بجز اُن چیزوں کے جو اُس میں کھلی رہتی ہیں۔ عورت کی "زینت" سے اُس کے حسن و جمال

ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا (ایضاً)	بناؤ سنگار، آرائش و زیبائش کی وہ تمام چیزیں مراد ہیں، جو مرد کی نظر میں اسے

خوشنما کر دکھاتی ہیں، اور مرد کے دل میں اس کے متعلق خواہش و تحریک پیدا کر سکتی ہیں۔ یہ "زینت" کا عام و وسیع مفہوم ہوا۔ لیکن سیاق عبارت چاہتا ہے، اور اکابر مفسرین اسی جانب گئے ہیں، کہ زینت سے یہاں مراد جسم کے مواضع زینت سے ہے۔

والمراد من الزینة موضع الزینة (بغویؒ)	زینت سے مراد موضع زینت ہے۔ (معالم التنزیل، بغویؒ)
والمراد من الزینة النظر الی مواضعها من البدن (خازن)	زینت سے مراد جسم کے مواضع زینت پر نظر کرنا ہے۔ (خازن)
وذکر الزینة دون مواضعها مبالغة فی الامر بالتصون والتستر (ابو حیان)	بجائے مواضع زینت کے، محض زینت یہاں اس لئے کہا گیا، کہ ان کے چھپانے اور ڈھانپنے پر زیادہ زور اور تاکید منظور تھا

(اس کے بعد اعضاء زینت کے نام گنائے ہیں، سر، سینہ، گردن، پنڈلی وغیرہ)

زینتھن، آرایش خود را، یعنی مواضع زیور را (شاہ ولی اللہ)	یہاں اپنی آرایش و زینت سے مراد مواضع آرایش ہیں۔ (فتح الرحمٰن، حضرت شاہ ولی اللہؒ)

گویا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ عورتیں اپنے جسم کے اُن حصوں کو، جو مرد کی نظر میں خواہش اور تحریک پیدا کرسکتے ہیں، چھپائے رکھیں، البتہ وہ حصے جو عادۃً یا ضرورۃً چار و ناچار کھلے رہتے ہیں[1]۔ اس حکم میں داخل نہیں (الا ما ظہر منہا) اب سوال یہ ہے کہ وہ مواضع زینت، وہ اعضاء جسم، جن کے لئے چھپانا ضروری نہیں، کون سے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں ما ظہر منہا کی تفسیر کیا ہے؟

اہل تفسیر کے درمیان اس باب میں اچھا خاصہ اختلاف ہے بعض نے اس سے مراد لباس لیا ہے، اور بعض نے ظاہری بناؤ سنگار کی دوسری چیزیں مثلاً سرمہ، انگوٹھی، وغیرہ لیکن لفظ "زینت" کا اگر وہ مفہوم صحیح ہے، جو اوپر درج ہوچکا، یعنی "زینت" سے مراد مواضع زینت اور اعضاء جسم ہیں، تو ظاہر ہے کہ اعضاء جسم سے استثناء بھی اعضاء جسم ہی کا ہوگا، اور (الا ما ظہر منہا) "جو چیزیں کھلی رہتی ہیں" سے مراد جسم ہی کے بعض حصے ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ تفسیر میں سے بعض مشاہیر اسی جانب گئے ہیں، اور تفاسیر ابن جریرؒ، معالم، خازن، بحر المحیط وغیرہ میں حضرت سعید بن جبیر، حسن بصری، ضحاک، و امام اوزاعی رحمہم اللہ سے صاف منقول ہے، کہ ان کھلی ہوئی چیزوں سے، جنھیں قید پردہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، مراد، الوجہ والکفان، چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں!

امام ابن جریر، صحابہ، تابعین، و تبع تابعین کے مختلف و متعدد اقوال و روایات نقل کرکے بالآخر اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سناتے ہیں:۔

واولی الاقوال فی ذلك بالصواب قول من قال عنی بذالك الوجہ والکفان	ان سب اقوال میں صحیح ترین قول ان کا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔

---

[1] الا ما ظہر منہا، یعنی الا ما جرت العادۃ والجبلۃ علی ظہورہ (ابو حیانؒ)

الا ما یظہرہ الانسان فی العادۃ الجاریۃ (قفالی)

متقدمین میں سب سے بڑے مفسر کے اس فیصلہ کے ساتھ متوسطین میں صاحب جلالین کے بھی اس قول کو ملاتے چلیے، کہ

الا ما ظھر منھا، وھوالوجہ والکفان	الا ما ظہر منہا سے مراد چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ہیں۔

متاخرین بھی اس باب میں متقدمین و متوسطین سے الگ نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے فارسی ترجمہ، قرآن میں الا ما ظہر منہا کا ترجمہ کرتے ہیں۔ "الا آنچہ ظاہر است ازین مواضع" اور اس کی توضیح حاشیہ فتح الرحمٰن میں کرتے ہیں، کہ ان

یعنی وجہ وکفین	کھلے ہوئے مقامات سے مراد چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ہیں!

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے الفاظ بھی تقریباً بالکل یہی ہیں:۔

الا آنچہ ظاہر است ازاں مواضع یعنی وجہ وکفین (تفسیر عزیزی ی دہلی صفحہ ۴۰)	بجز اُن مقامات کے جو کھلے ہوئے رہتے ہیں، یعنے چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں

اکابر تفسیر کی ان تصریحات کے بعد کم سے کم اس بدگمانی کا تو موقع نہیں کہ چہرے اور ہتھیلیوں کو پردہ سے باہر رکھنا بیسویں صدی عیسوی کی جدت ہے۔ یہ اگر تفسیر بالرائے ہے تو اس جرم میں حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، ضحاکؒ، اوزاعیؒ، ابن جریرؒ و صاحب جلالینؒ سے لے کر شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ تک سب شریک ہیں۔ ان ائمہ تفسیر کے علاوہ ہر مذہب کے فقہا کے ہاں بھی یہ صراحت موجود ہے، کہ چہرہ اور ہاتھ (اور بعض کے نزدیک پیر بھی) داخل ستر نہیں۔ قاضی القضاۃ ابن رشد، مالکی اندلسی، جو چاروں مذاہب فقہ کے ایک معتمد و مستند عالم تھے لکھتے ہیں۔

واما المسئلۃ الثالثۃ وھی حد العورۃ فی المرأۃ، فاکثر العلماء ان بدنھا کلھا عورۃ ما خلا الوجہ والکفین وذھب ابوحنیفۃ الی ان قدمھا	تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ عورت کے ستر کے حدود کیا ہیں۔ تو اکثر علما کا قول ہے، کہ اس کا سارا جسم ستر ہے بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت

لیست بعورۃ (بدایۃ المجتہد، مصر، جلد اول صفحہ ۹۰) | کے پیر بھی ستر سے باہر ہیں۔

فقہ حنفی پر آج جس قدر مستند و متداول کتابیں ہیں، ہدایہ، کنز، درمختار، اور ان کے شروح و حواشی، سب میں یہ جزئیہ درج ہے، کہ عورت کے ستر سے اُس کا چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں بعض علماء حال نے اپنی تحریروں میں یہ قید لگادی ہے، کہ اس ستر سے مراد صرف حالت نماز کا حکم ہے، لیکن اس قید کی دلیل اب تک تلاش سے بھی نہ مل سکی، اور نہ ایسی تخصیص کتاب و سنت سے نکلتی معلوم ہوتی ہے۔

اہل تفسیر کی تشریحات اور فقہاء کے قیاسات قطع نظر کرکے، خوش قسمتی سے خود سرورِ کائنات کی ایک فیصلہ کن حدیث اس باب میں موجود ہے، جس کے بعد پھر کسی مزید بحث کی گنجایش ہی نہیں رہ جاتی۔

عن عائشۃ ان اسماء بنت ابی بکر دخلت علیٰ رسول اللہ صلعم وعلیھا ثیاب رقاقٌ فاعرض عنھا وقال یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لن یصلح ان یریٰ منھا الا ھذا وھذا واشار الی وجھہ وکفیہ (مشکوٰۃ کتاب اللباس بحوالہ ابوداؤد)

عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رسول خدا صلعم کے پاس آئیں اور بہت باریک لباس اُن کے جسم پر تھا۔ پس آپؐ نے ان کی طرف سے منھ پھیرلیا، اور فرمایا کہ اے اسماء جب عورت جوان ہوجائے، تو پھر درست نہیں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے، بجز اس کے اور آپ نے اپنے چہرہ اور ہتھیلیوں کو اشارہ سے بتایا۔

ارشاد مبارک بالکل صاف و صریح ہے۔ چہرہ اور کف دست کو ستر سے باہر رکھنے کا ارشاد عام اور مطلق صورت میں ہے، حالت نماز وغیرہ کسی قسم کی قید نہ الفاظ میں ہے، نہ سیاق ہی سے نکلتی ہے۔ اس واضح فرمان کے بعد کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور الا ما ظہر منہا کی تفسیر بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

پردہ مروجہ کی حامیوں کی طرف سے ایک عقلی اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب چہرہ ہی کے، جو اصل محل فتنہ ہے، کھلے رکھنے کی اجازت مل گئی، تو پھر باقی جسم کے ڈھکے رہنے سے کیا نتیجہ؟ لیکن یہ اعتراض کچھ بھی قوت نہیں رکھتا۔ اول تو جب نص حدیث چہرہ کے کھلے رہنے کی بابت مل گئی، تو اس کے معاوضہ و مقابلہ میں اس قسم کی قیاسی موشگافیاں سرے سے قابل توجہ ہی نہیں۔ دوسرے، جس خطرہ کو سوال میں پیش کیا گیا ہے، تجربہ کی شہادت ہے، کہ وہ خطرہ بھی درست نہیں۔ چہرہ سے مراد صرف چہرہ ہی ہے، نہ کہ چہرہ کے حوالی و اطراف اور جس شئے کے کھلے رہنے کی اجازت ملی ہے، وہ صرف آنکھیں، ناک، منھ اور رخساروں کا ایک حصہ ہے، جسے ٹھیٹھ اردو میں "چہرہ کی ٹکیا" کہتے ہیں۔ کان، گلا، کنپٹی، سر، پیشانی کا اوپری حصہ، ان میں سے کسی شئے کے کھلے رکھنے کی اجازت نہیں چہرہ میں حسن و زیبائش اور مرد کے لئے کشش اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب چہرہ کو آزادی کے ساتھ مع اس کے اطراف و حوالی کے کھول دیا جائے، اور نظریں بجائے نیچی ہونے کے اونچی ہوں، لیکن اگر سر و گردن وغیرہ سب احتیاط سے ڈھکے ہوں، آنکھیں حیا کے ساتھ جھکی ہوئی ہوں، تو محض چہرہ کی ٹکیا کھلے رکھنے سے فتنہ کا مطلق اندیشہ نہیں حسن و دلکشی پیدا کرنے والی شئے اعضاء کا تناسب ہے لیکن اگر یہ تناسب چھپا ہوا رہے۔ گرد و پیش کے اعضاء جو تناسب پیدا کرتے ہیں، ان سب پر پردہ پڑا رہے، تو محض چہرہ کی ٹکیا، اور وہ بھی نیچی اور حیادار نظروں کے ساتھ، ایک بالکل بے ضرر شئے ہے۔

تیسرا حکم پردہ کے سلسلہ میں یہ ملتا ہے کہ عورتوں کو بالائی حصہ جسم کا لباس ایسا اختیار کرنا چاہیئے، جو ان کے مقامات زینت کو خاص طور پر ڈھانپ لے۔ ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن یعنی اپنی اوڑھنیوں سے وہ اپنے گریبانوں کو خوب چھپائے ہوئے رہیں۔ خمار اس اوڑھنی کو کہتے ہیں جو سر ڈھانپنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہاں ارشاد ہوتا ہے، کہ اس اوڑھنی سے محض سر ہی کو نہ چھپایا

جائے بلکہ اُسے اس طرح اوڑھا جائے، کہ گریبان (جیوب) تک اُس سے چھپ جائیں۔ یعنی سر کے بال، کان، گردن، شانہ، سینہ، کا کوئی حصہ کھلا نہ رہے، اور یہ سب پردہ میں آجائیں۔ فتنہ کا جو اندیشہ چہرہ کے کھلا رکھنے سے ممکن تھا، اُس کا پورا سدِباب اس حکم سے ہوجاتا ہے۔ اسی ہدایت کو زیادہ موثر و مؤکد بنانے کے لئے چوتھا ارشاد، ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کے ساتھ عام مومن عورتوں کو یہ ہوتا

یٰایھا النبی قل لازواجك و بناتك ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن۔ ذلك ادنیٰ ان یعرفن فلایوذین

ہے، کہ باہر نکلتے وقت وہ اپنی چادریں اپنے اوپر ذرا نیچی لٹکا لیا کریں، تاکہ پہچان لی جائیں، کہ وہ پارسا و باعفت عورتیں ہیں۔ اور چھیڑ چھاڑ سے انھیں ایذا نہ پہونچائی جائے۔

آیت کی جو شان نزول، احادیث صحیحہ کی بنا پر تمام تفسیروں میں منقول ہے اس نے "باہر نکلتے وقت" کی قید کو ضروری بنا دیا ہے۔ اور عقلاً بھی چادر لپیٹنے یا گھونگھٹ نکالنے کی ضرورت اُسی وقت ہوسکتی ہے، جب باہر نکل کر مردوں کا سامنا ہونے کا موقع ہو۔ جلباب کے عام لغوی معنی قمیص اور خمار کے ہیں[1]۔ اور اُردو و فارسی کے مترجمین قرآن نے عموماً اس کا ترجمہ "چادر" سے کیا ہے، لیکن صاحب تاج العروس نے لسان العرب کے حوالہ سے اس کے معنی اُس کپڑے کے لئے ہیں، جس سے

تغطی به المرأۃ رأسھا وصدرھا | عورت اپنا سر اور سینہ چھپائے رکھتی

ہے گویا چہرہ چھپانے والے کپڑے کا مفہوم لغت سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ پھر امام ابن جریرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اودنا جلباب کی شرح میں جو مختلف اقوال نقل کئے ہیں، اُن میں سے حضرت عباسؓ کا جو قول محمد بن سعد کے واسطہ سے منقول ہے اس میں جلباب کو صرف پیشانی پر باندھنا مذکور ہے، چہرہ کے چھپانے کا ذکر نہیں۔ غرض تیسری اور چوتھی آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اصلی تاکید، جاہلیتِ عرب و جاہلیتِ فرنگ کی بے حیا عورتوں کے دستور اور فیشن کے برعکس، مومن عورتوں

---

[1] والجلابیب والقمص والخمر (راغب)

کو اس کی ہے ۔ کہ باہر نکلتے وقت، اور غیر مردوں کا سامنا ہوتے وقت چہرہ کے حوالی و اطراف، سر، پیشانی، گردن، شانہ و سینہ وغیرہ کو ڈھکا ہوا رکھیں، اور بالکل ظاہر نہ ہونے دیں۔ اصلی پردہ انھیں اعضا کا پردہ ہے۔ اور اگر ادنائے جلباب میں چہرہ چھپانے کا مفہوم داخل بھی سمجھا جائے تو یہ حکم عام اور مطلق نہ ہوگا، بلکہ محض چھیڑ چھاڑ اور ایذا سے بچنے کے لئے ہوگا، جیسا کہ خود آیت میں تصریح موجود ہے۔ اور صرف انھیں حالات میں واجب العمل ہوگا، جب چہرہ کھلنے سے فتنہ کا دروازہ کھل رہا ہو۔

اسی اخفاء زینت کی تاکید میں ایک اور آیت بھی آئی ہے۔ جسے پردہ کے سلسلہ میں پانچویں آیت شمار کرنا چاہیئے۔ اس میں مسلمان عورتوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن کہ اپنے پیروں کو زمین پر اس طرح نہ رکھیں، جس سے، اُن کی چھپی ہوئی زینتیں ظاہر ہو کر رہیں۔ عام مفسرین نے پیر کی زینتوں سے مراد صرف پیر کے زیوروں سے لی ہے، لیکن کلام پاک کے الفاظ اس قدر وسیع و جامع ہیں، کہ وہ ہر فتنہ جو عورتوں کی رفتار سے پیدا ہو سکتا ہے، ان کا ناز و انداز سے چلنا، ناچ گھروں میں ان کا تھرکنا، قواعد رقص کے مطابق ان کا پیروں کو حرکت دینا، ساق کی خوشنمائیوں کو ظاہر کرتے رہنا، غرض عورت کی ٹانگوں کے ذریعہ سے مرد کو لبھانے والی وہ ایجادیں جو آج فرنگی دماغ کر چکے ہیں، اور جو کل عرب جاہلیت میں رائج تھیں، سب اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔

اسی کے ساتھ جو فتنہ نرم آوازی کی بنا پر پیدا ہو سکتا ہے، اور عورت کی کی ملایم و شیریں آواز سن کر مرد کے دل میں جس طرح تحریک پیدا ہو سکتی ہے، اس کا فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولاً معروفاً خصوصیت سے سد باب کیا ہے، لیکن اس احتیاط کے ساتھ دوسری طرف عورت کی آواز کو پردہ کے حدود میں داخل نہیں کیا گیا ہے، یعنی یہ ارشاد نہیں ہوتا، کہ عورت سرے سے اپنی آواز ہی

غیر مرد کو نہ سننے دے، بلکہ حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ غیر محرموں سے کلام کے وقت وہ لب و لہجہ ایسا نہ رکھیں، جس سے کوئی فتنہ پیدا ہو سکے۔ یہ آیہ کریمہ خاص اُمہات مومنین سے متعلق ہے۔ لیکن جب امت کی اُن ماؤں پر، جن پر اُن کے علوے مرتبت وکمال تقویٰ کی بنا پر بہت زیادہ قیدیں لگائی گئی ہیں، آواز کا پردہ فرض نہیں ہوا تو عام مومنات کے لیے جنھیں اپنی روزانہ ضروریات کے لیے غیروں سے گفتگو کی بہت زیادہ ضرورت پیش آتی رہتی ہے، کوئی ایسا حکم اور بھی غیر ضروری ہے

غرض نگاہیں نیچی رکھنے، شرم و حیا کو اپنا شعار بنائے رہنے، چال ڈھال، بات چیت میں انتہائی احتیاط برتتے رہنے، جسم کے جو حصے محل فتنہ بن سکتے ہیں، ان سب کو چھپائے رکھنے کے احکام کلام مجید میں تصریح و تکرار کے ساتھ وارد ہیں۔ اور یہی اسلامی پردہ کے حدود ہیں۔ جو عورتیں انھیں توڑنا چاہتی ہیں، نامحرموں سے آزادی و بے تکلفی کے ساتھ میل جول کی آرزو مند ہیں، فرنگنوں کا موجودہ لباس زیب تن کرنا چاہتی ہیں، وہ یقیناً اسلامی پردہ کے حدود سے اپنا قدم باہر نکال چکیں۔ ان کی حالت پر افسوس، اور اُن کے حق میں دعائے خیر کے علاوہ کچھ چارہ نہیں لیکن چہرہ اور آواز اور کف دست کو بھی لازمی طور پر ان حدود کے اندر شامل رکھنا، نہ کتاب اللہ کی کسی آیۂ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے نہ سنت رسولؐ سے۔ واللہ اعلم و علمہٗ احکم۔

یہ ساری گفتگو جسم عورت کے متعلق تھی۔ لیکن اسی کی مساوی اہمیت کا ایک دوسرا سوال، کم سے کم ہندوستان کے بعض صوبوں اور علاقوں میں "چار دیواری کے پردہ" نے پیدا کر دیا ہے۔ پردہ شکن جماعت کا یہی سب سے بڑا اعتراض اس پر ہے اور حامیان پردہ کا بھی عام طبقہ عورتوں کی اسی خانہ نشینی ہی کو اصلی اسلامی پردہ سمجھے ہوئے ہے۔ قرآن پاک میں اس بحث سے متعلق صرف ایک آیت ملتی ہے اور اسی سے حامیان پردہ استدلال و استشہاد کرتے ہیں۔ ازواج مطہرات کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے، کہ

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ	اپنے گھروں میں قرار پکڑے رہو اور جاہلیت اولی کی طرح اپنا سنگار دکھاتی نہ پھرو۔

جاہلیتِ عرب میں، ٹھیک آج کل کی فرنگنوں کی طرح، عورتوں کے لیے نیم برہنہ لباس کے اور اپنے حسن و جمال کی نمایش کرتے رہنے کا دستور عام تھا آیۂ بالا کے دوسرے حصہ میں اس سے روکا ہے اور پہلے حصہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وقرن فی بیوتکن۔ اس ارشاد کا پہلا لفظ بجائے خود بحث طلب ہے عام مفسرین نے قرن کو قرار سے مشتق قرار دے کر اقررن کے بجائے سمجھا ہے اور اس کے معنی قرار پکڑنے، سکونت اختیار کرنے، اور ٹھہرے رہنے کے لیے ہیں لیکن بصرہ اور کوفہ کے عام قاریوں کے نزدیک، صحیح قرأت بجائے قرن (بفتح قاف) کے قِرن (بکسر قاف) ہے جس کا مصدر "قرار" نہیں، "وقار" ہے، اور معنی یہ ہیں، کہ متانت و وقار سے رہو۔ محققین ائمہ تفسیر نے اسی پہلو کو ترجیح دی ہے۔ امام جریر لکھتے ہیں

واختلفت القراء فی قراۃ قوله وقرن فی بیوتکن وقراء ذلك عامة قراء الكوفه والبصرة وقِرن بكسر القاف بمعنی كن اهل وقار وسكينة فی بیوتكن وهذه القراة وهی الكسر فی القاف اولی عندنا بالصواب	قاریوں کا اس آیت کی قرأت کے بارے میں اختلاف ہے بصرہ اور کوفہ کے عام قاریوں نے اسے قِرن (بکسر قاف) پڑھا ہے جس کے معنی ہیں کہ اپنے گھروں میں وقار و سکینۃ اختیار کرو اور یہی قرأت یعنی بکسر قاف ہمارے نزدیک صحیح تر ہے۔

قاضی بیضاوی نے بھی قِرن کے اشتقاق میں کئی قول نقل کیے ہیں، اور ان میں سب سے پہلے اسی کو لکھا ہے کہ وقِرن یقِر وقارًا سے مشتق ہے۔ اور بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں مختلف اقوال اور قرأتیں نقل کر کے قول اصح اسی کو قرار دیا ہے

وهوالاصح انه امر من الوقار كقوله من الوعد عدن ومن الوصل صل	کہ یہ مصدر "وقار" سے صیغۂ امر ہے جیسے "وعد" سے "عِدن"، "وصل" سے

صلن اى كن اهل وقار وسكون	"صلن" اور معنی یہ ہیں کہ اہل وقار وسکون بن جاؤ

اسی طرح خازن نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے ۔

وقيل هو امر من الوقار اى كن اهل وقار وسكون	ایک قول یہ ہے کہ یہ "وقار" سے امر ہے یعنے اہل وقار وسکون بن جاؤ

اور شاہ عبد العزیز دہلوی رح کی تفسیر میں بھی پہلے یہی قول نقل ہوا ہے کہ

قوله وقرن یعنی به وقار باشید درخانہائے خود (صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ دہلی)	قرن کے معنی ہیں "اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہو ۔

اہل لغت کی شہادت بھی اس باب میں اسی فریق کا پلہ جھکا رہی ہے جو آیہ کریمہ کے معنی وقار وسکون سے رہنے کے قرار دے رہا ہے ۔ چنانچہ راغب اور صاحب تاج العروس دونوں نے آیہ مذکورہ کو لغت "وقر" و "وقار" ہی کے تحت میں نقل کیا ہے ۔

ان سب شہادتوں کی تائید سیاق عبارت سے بھی ہوتی ہے ۔ جب آیت کے ایک ٹکڑے میں "تبرج" یعنی حسن وجمال کی نمائش سے روکا ہے تو قرینہ یہ ہے کہ آیت کے دوسرے ٹکڑے میں اس کے بالمقابل وقار وتمکنت کی تاکید ہو ایک طرف بیحیائی اور چھچھورا پن ہے اور دوسری طرف وقار وتمکنت مقابلہ اور جوڑ انھیں چیزوں کا ہے ۔ صحیح تضاد وتقابل تبرج ووقار ہی کے درمیان ہے ۔

پھر اگر اس حکم سے مراد خانہ نشینی ہی لی جائے تو بعض اکابر علماء کا خیال ہے کہ یہ حکم امہات مومنین رض کے لیے مخصوص ہے ۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح اس حدیث عائشہ رض کی شرح میں جس میں رسول اللہ صلعم نے حضرت اسماء کو باریک لباس سے منع فرمایا اور جو اوپر نقل ہو چکی ہے لکھتے ہیں کہ

ایں ستر عورت ست مر زن را وحجاب آنست کہ از خانہ پیش مردم بیرون نیاید اگرچہ پوشیدہ باشد و آن خواص ازواج	یہ (یعنی بجز چہرہ اور کف دست کے باقی جسم کو چھپا رکھنا) تو ستر عورت ہوا ۔ اور حجاب اسے کہتے ہیں کہ باوجود لباس ستر پوش کے عورت گھر سے باہر نکل کر

مطہرہ آنحضرت ست (شرح مشکوٰۃ)

مردوں کے سامنے نہ آئے اور یہ آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات کی خصوصیات میں سے تھا۔

اور پھر ان مقدس بیویوں کے لئے بھی خانہ نشینی کا حکم مطلق وغیر مشروط صورت میں نہیں، بلکہ ضرورتوں کے لئے انھیں بھی گھر سے باہر نکلنے کی اجازت صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

قد اذن لکن ان تخرجن لحاجتکن (صحیح بخاری، کتاب التفسیر)

تمھارے لئے اجازت ہے، کہ تم اپنی ضرورت کے لئے باہر نکل سکتی ہو۔

چنانچہ ازواج نبی رضی اللہ عنہن کا طرز عمل بھی اسی تعلیم کے مطابق تھا۔ بلا ضرورت گھومتے رہنے سے وہ بلا شبہ بالکل محتاط تھیں۔ خواہ مخواہ باہر کی سیر کرتے رہنا، انھوں نے اپنے لئے قطعاً حرام رکھا تھا۔ لیکن آخر حج کرنے جاتی تھیں، صحابہ تابعین کو احادیث رسول سناتی تھیں اور حضرت بی بی عائشہؓ نے واقعہ جمل میں طویل سفر اور فوج کی رہنمائی بھی اختیار کر لی تھی۔ مشہور محدث حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

قد کن بعد النبی صلعم یحججن ویطفن وکان الصحابۃ ومن بعدھم یسمعون منھن الحدیث وھن مستترات الابدان لا الاشخاص (فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۴۲ مصری)

ازواج مطہرات، رسول اللہ صلعم کے بعد حج کرتی رہیں، طواف کرتی رہیں، اور صحابہؓ اور ان کے بعد والوں سے روایت حدیث کرتی رہیں۔ ان کے بدن ڈھکے ہوئے رہتے تھے، لیکن وہ خود پردہ میں نہ تھیں۔

ان تمام مجموعی شہادتوں پر نظر کرنے کے بعد یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جائے، کہ عورت کے لئے گوشہ نشینی یا پردہ نشینی اسلامی تعلیم کا لازمی جزو ہے۔

عورت کو گھر کی چار دیواری کے اندر بند کر دینے کا حکم کلام مجید میں صرف ایک مقام پر ہے، اور وہ بطور سزا کے ہے، وہ سزا بے حیائی یا آوارگی کی ہے۔

واللّٰتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم

عورتیں بے حیائی کی مرتکب ہوں، اور

فاستشهدوا علیھن اربعۃ منکم فان شھدوا فامسکوھن فی البیوت | چار گواہ گواہی دینے والے مل جائیں ان کے لئے ارشاد ہے کہ انھیں گھروں میں بند رکھو۔ یہ حکم قرآن پاک کے ہر حکم

کی طرح، ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانہ کے لئے ہے۔ آج یہی بے حیا عورتوں کا سزاوار تادیباً اگر گھروں سے باہر قدم نکالنا روک دیا جائے تاکہ نہ خود مزید بے حیائیوں میں مبتلا ہوسکیں، اور نہ ان کا زہر دوسروں تک متعدی ہوسکے، تو یہ عین اسی حکم ربانی کی تعمیل ہوگی۔

غرض، جہاں تک آیاتِ قرآنی وسنت رسولؐ کا تتبع کیا جاسکتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ اسلام نے مومن عورتوں کو پردہ کے سلسلہ میں احکامِ ذیل کا پابند لازمی طور پر بنایا ہے:۔

(۱) نگاہیں نیچی رکھیں۔

(۲) لباس ساتر پہنیں۔ نہ باریک ہو جس سے جسم نظر آئے، اور نہ مختصر ہو جس سے کوئی مقامِ زینت کھلا رہے۔

(۳) چال ڈھال، بات چیت، ہر شئے میں شرم و حیا، عفت و عصمت کو اپنا شعار رکھیں۔

(۴) بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے اپنے سارے جسم کو نامحرموں کی نظر سے چھپائیں۔

(۵) باہر نکلیں تو گھونگھٹ نکال کر، یا ایسا برقعہ پہن کر، جس سے چلنے پھرنے یا کام کاج کرنے میں ہرج نہ ہو۔

(۶) باہر صرف ضرورۃً نکلیں۔ بلاضرورت دوکانوں کی سیر، کلبوں کی نشست پارکوں میں گلگشت ناجائز و ممنوع۔

(۷) نامحرم کے سامنے ہر حال میں اپنے وقار و تمکنت، عزت و خودداری کو قایم رکھیں، جس سے اُس کے دل میں کسی بدی کی ہمت ہی نہ پڑنے پائے۔

چہرہ کا پردہ اور چار دیواری کا پردہ، میری ناقص، فہم و محدود بصیرت میں لازمی اور قطعی طور پر، کتاب و سنت سے نہیں نکلتا[1]۔ البتہ جہاں فتنہ کا امکان قوی، یا احتمال ہو، وہاں یہ قیود، اور ان کے علاوہ دوسری پابندیاں بھی ضروری ہوجائیں گی۔ اسلام نے ان پابندیوں سے روکا ہرگز نہیں ہے، لیکن، میرے علم میں، ان پابندیوں کو لازمی بھی نہیں کیا ہے، بلکہ عام اصول اور چند لازمی قواعد بنا کر، ان قیود کو ملک و قوم کی حالت پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ سوال کہ کس ملک اور قوم کی حالت، ان قیود کو کہاں تک لازمی کر رہی ہے، اصل موضوع سے علٰحدہ ہے۔ اس کا تصفیہ کرنا، جیسا شروع مضمون میں عرض کیا جا چکا ہے، ہر ملک و قوم کے فہمیدہ اہل حل و عقد و علماء متدین کا کام ہے۔ اللہ اعلم و علمہٗ احکم۔

---

[1] مصالح عقل کا مقتضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ اور چار دیواری کے پردہ کو لازمی نہ قرار دیا جائے اس لئے کہ اس حکم کی عالمگیر تعمیل تقریباً محال ہے۔ کاشت کاروں کی عورتوں کے لئے کیونکر ممکن ہے کہ اپنے خاوندوں کو کھیت کے کام میں جا کر مدد نہ دیں؟ نائی، دھوبی، مہتر، کمہار، وغیرہ جتنے خدمت پیشہ طبقے ہیں، اُن سب کی عورتیں اپنے پیشے کی خدمات کے لئے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح وہ ساری عورتیں جنھیں اپنے ہاتھ سے سودا خرید کرنا یا فروخت کرنا ضروری ہے۔ ان سب طبقات کی عورتوں کے نکل جانے کے بعد مسلمان عورتوں کی کتنی قلیل تعداد باقی رہ جاتی ہے جو رواجی پردہ کی پابندیاں برداشت کر سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جن صوبوں میں عورتوں کے باہر نکلنے کا رواج زیادہ ہے ان کا تو ذکر ہی نہیں، جن صوبوں میں پردہ بہت زیادہ سخت ہے، مثلاً صوبہ متحدہ، وہاں بھی بجز خوش حال شرفاء کے اور کسی طبقہ کی عورتوں کے لئے گھروں کے اندر پردہ میں بیٹھے رہنا ممکن نہیں۔

ایک مغربی کی مشرقیت

کوئی دو سال اُدھر کا ذکر ہے کہ لندن کی چھپی ہوئی ایک ضخیم و مستند کتاب ہندوستان پہنچی، عنوان LOVE MARRIAGE JEALOUSY (محبت، ازدواج، رقابت)، موضوع، عنوان ہی سے ظاہر۔ ضخامت ۳۹۸ صفحات۔ کتاب کی تالیف میں متعدد ماہرینِ فن شامل۔ کتاب بیس بابوں میں تقسیم، ہر باب ایک ایک ماہرِ فن کے قلم سے نکلا ہوا۔ اور ان ماہرین میں مرد ہی نہیں، خواتین بھی شریک، زیادہ تر پیرس، لندن، برلن، ویانا، بوڈاپسٹ، اسٹاکہام، اور دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ۔ مرتب اعلیٰ لندن کے ڈاکٹر فوربا بخ۔ کتاب میں بہترین مقالات پروفیسر مورسین اسٹاکہام اسٹاکا یونیورسٹی کے قلم سے ہیں۔ ذیل میں موصوف کے ایک مقالہ "نارمل میکسے لیٹی" (طبعی جنسیت) کا ضروری ملخص جابجا سے درج ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ تمدن جدید کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ مرد و عورت اس آزادی کے ساتھ اور ایسے ہیجان پرور ماحول میں ملتے چلتے رہتے ہیں کہ گزشتہ نسلوں کو اس کا خیال ہی نہ تھا آج کی سوسائٹی میں کھیل تماشوں کا شوق جس حد تک بڑھ گیا ہے، اس نے رومی زمانہ کے شوقِ تماشا بینی کو بھی مات کر دیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آج تماشے سب سے زیادہ مقبول وہی ہیں جن میں مرد و عورت دونوں ہی حصہ لے رہے ہوں، دونوں کے درمیان حجاب، جو پچھلی نسلوں کا طرۂ امتیاز تھا، آج مفقود ہو چکا ہے، پہلے مرد و عورت اگر بعض تماشوں، مثلاً رقص میں اکٹھا ہوتے بھی تھے، تو

احتیاطیں اور تدبیریں ایسی کرلی جاتی تھیں، کہ کوئی شہوانی فتنہ بڑھنے نہیں پاتا تھا۔

اب صورتِ حال بالکل برعکس ہے۔ لڑکیوں کے ساتھ "نگراں" کے رہنے کی رسم ہی مٹ چکی ہے، نہ اس کی احتیاط باقی رہی ہے کہ ناچ میں شرکت جانے بوجھے شریف زادے ہی کریں، اور وہ بھی "نگراں" کی نگرانی میں۔ پھر خود رقص کا طریقہ بھی روز بروز زیادہ ہی شہوانی ہوتا چلا گیا ہے۔ رقص خواہ وہ کسی زمانہ کا اور کسی صورت سے ہو، یوں بھی اُس سے بڑھ کر کوئی چیز محرکِ شہوت نہیں۔ ہم آغوشی کی لذت، اور اسی حالت میں مخصوص جسمانی حرکتیں، پھر نشاط انگیز راگ، پھر کسی خواجہ سرا کے، کون مرد ایسا ہوگا جس کی آتشِ شہوت بھڑک نہ اٹھے؟ رقص کا شوق، خواہ وہ شوق تماشائے رقص کا ہو یا خود ادائے رقص کا اصلاً ایک جنسی ہی شوق ہے۔ ممکن ہے اس حقیقت سے ناگواری کے ساتھ انکار کر دیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض افراد کو شعوری طور پر اس کا پورا احساس نہ ہو، لیکن بہر حال ہے اس شوق کی بنیاد جنسی ہی، مردوں عورتوں دونوں میں۔ اس متحرک ہم آغوشی میں ایسی شدید لذت محسوس ہوتی ہے کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کو بارہا اس حال میں انزال ہو ہو گیا ہے!

کھیل بھی مخلوط قسم کے بہت سے ایسے نکلے ہیں جن سے جذبات شہوانی کو برابر تحریک ہی ہوتی رہتی ہے۔ ٹینس اور گالف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موٹر کے رواج نے "تخلیہ" کے بہترین مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ اور امریکی زبان میں "بوس و کنار پارٹیاں" تو گویا انھیں کے دم سے قائم ہیں۔ ان طرح طرح کی "تفریحوں" یہ محرکِ نفس، مہیجِ شراب کے دورِ مستزاد۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگلستانی اور امریکی سوسائٹی میں ایسے سن کے بچوں میں اور اُن سے بڑھ کر بچیوں میں قوائے شہوانی بیدار ہو جاتے ہیں کہ اگلوں کے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

مغربی تہذیب کی ایک جدید اور روز افزوں خصوصیت، مخلوط غسل اور اُس کے متعلقات ہیں۔ مثلاً سمندر کے کنارے جاذبِ نظر نیم برہنہ لباس میں گلگشت اکثر انسانوں کے لئے یہ دونوں چیزیں انتہائی شہوت انگیزی کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ

خوب خیال رہے کہ جہاں تک شہوت انگیزی کا تعلق ہے، تمدن جدید کی نیم عریانی، وحشیوں کی کامل عریانی سے بالکل مختلف ہے۔ برہنگی پر جو میری مستقل تصلیف ہے اُس میں لکھ چکا ہوں کہ برہنگی بجائے خود ذرا بھی مہیج نفس نہیں۔ اس کی ساری شہوت انگیزی کا راز رواج لباس ہے۔ بے لباسی صرف لباس کے مقابل میں اثر تحریک شہوت کا رکھتی ہے۔ یہ تو کچھ ڈھکا کچھ کھلا ہوتا ہے جو قلب میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے اور اس کا تجربہ جب دل چاہے، کیا جا سکتا ہے سڑکوں پر مجمع آخر کن عورتوں کے پیچھے لگ جاتا ہے؟ وہی جو خوب بنی ٹھنی، بہترین فیشن کے لباس میں چٹک مٹک دکھاتی چلتی ہیں، نہ کہ اُن کے جو میلے کچیلے کپڑے پہنے، دبی سکڑی ہوئی راہ طے کرتی رہتی ہیں۔

آج کی نوجوان بن بیاہی خاتون نے مردوں کے رجھانے، لبھانے کے فن میں درجۂ کمال حاصل کر لیا ہے وہ اس شہوانی ودلکشی کا نام جو چاہے رکھ لے، اور چاہے واقعی اس کو اس کی خبر بھی نہ ہو، لیکن ہے یہ واقعہ کہ اب وہ دلبری و دلربائی کے فن میں ویسی ہی طاق ہو گئی ہے جیسی [لندن کی معروف وبدنام گلی] پکیڈلی کی کوئی لکھا بیسوا ہو سکتی ہے۔ عورت کا موجودہ لباسِ غسل اپنی اصل ضرورت وغایت کے پورا کرنے کے لحاظ سے جیسا بھی کچھ ہو، عورت کی رعنائی ودلکشی کے بڑھانے کا ذریعہ تو بہرحال ہے۔

عورت کی "آزادی" نے بھی خواہ وہ معاشی اعتبار سے ہو یا معاشری یا جنسی اعتبار سے، اُس کی رعنائی لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ پھیلا رکھی ہے اور ساتھ ہی اس کے انتہائی مواقع بھی فراہم کر رکھے ہیں، کہ وہ اپنی شہوت پرستی کے جذبات کو خوب جی بھر کے تسکین دے سکے اب وہ شادی کی محتاج نہیں، اور اس کی ضرورت تو اُسے اور بھی باقی نہیں کہ نان ونفقہ کی تلاش میں وہ کم سنی ہی میں کسی کے عقد میں آ جائے۔ مختلف پیشوں کا، تجارتوں کا، ملازمتوں کا دروازہ عورت کے لئے کُھل جانا اُس کی شہوانی زندگی پر نہایت درجہ موثر ہوا ہے۔

عورت کی "معاشی آزادی" اور شوہر کی محتاجی سے اس کی رہائی نے شادی کی ضرورت کو اس کے سامنے بہت ہلکا کر ہی دیا ہے، باقی یوں بھی اس میں ہر طرح خیر ہی خیر نہیں ہے اس کے اثرات جو پڑے ہیں اُنھوں نے اس کی شہوانیت کے حدود کو بہت ہی وسیع کر دیا ہے، اور اس کے لئے مواقع ایسے ایسے بہم پہنچا دیے ہیں، جو پہلے زمانہ میں سخت قابل ملامت سمجھے جاتے تھے۔ پھر جنسی مسائل کی تعلیم عام، خصوصاً منع حمل کے طریقوں کی اشاعت عام اور ان آلات کی فراہمی عام نے عورت کو شہوانی آوارگی اور بدچلنی کے نتائج کی طرف سے الگ بے فکر کر دیا ہے۔ کسی بن بیاہی کا باکرہ نہ ہونا پچھلے زمانہ میں تفضیح و رسوائی کا انتہائی مقام تھا۔ جنسی آزادی" کے دور میں وہ ایک معمولی بات بن گئی ہے۔ ان دونوں موثرات، یعنی ایک تو تدابیرِ منع حمل، دوسرے دوشیزگی کی بے وقعتی، نے مل ملا کر صورتِ حال یہ پیدا کر دی ہے کہ نوجوان عورتیں، تقریباً سب کی سب بدچلنی کے لئے بس موقع ہی کی منتظر رہنے لگی ہیں۔ اور سوسائٹی کے ہر طبقہ کی عورتوں میں شہوانی بدچلنیوں میں پڑنے کا شوق بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

عورتوں کا بڑی اور روز افزوں تعداد میں ملازمتی اور کاروباری سلسلوں میں داخل ہونا بجائے خود سبب ہے آوارگی و بدچلنی کا۔ پچھلے زمانہ کی الگ تھلگ رہنے والیوں کو مردوں کے ساتھ اس آزادانہ اور بے تکلف اختلاط کے مواقع ہی اول تو کہاں حاصل تھے، اور پھر اب تو لڑکیوں کے لئے ملازمت میں داخلہ اور عہدہ میں ترقی کی شرط ہی دوشیزگی کی نذر قرار پا گئی ہے۔ تھیٹر اور سینما کی زندگی میں تو یہ ہوا عام ہو ہی چکی ہے لیکن بعض اور دوسری ملازمتیں بھی بجز بیسوائی زیر نقاب کے اور کچھ نہیں۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ جدید عورت کا لباس بجائے خود محرک نفس لباس ہے۔ کہنا یہ چاہیئے کہ آج عورت کی دلکشی، زنانہ لباس ہی کی دلکشی ہے۔ لباس کا مقصد ہی غالباً تحریکِ جذبات تھا اور یہ مقصد اب صدیوں کے بعد پوری طرح حاصل ہو چکا ہے۔ خوش لباسی کے جادو کا حال کوئی بیسواؤں کے دل سے پوچھے اور

پھر جدید ایکٹرسوں سے یہی فن سوسائٹی کی حسین و جمیل خاتونوں نے بھی ہر زمانہ میں سیکھ رکھا ہے، اور اب اس فن کے رموز و اسرار تقریباً ساری زنانی آبادی میں عام ہو گئے ہیں اب شریف گھرانوں کی عورتیں اور اہل حرفہ کی عورتیں سب اس باب میں پیشہ ور بیسواؤں کی حریف و مقابل ٹھہر گئی ہیں، وہ رنگے ہوئے رخسار، وہ رنگے ہوئے ہونٹ وہ رنگے ہوئے ناخون، جو ابھی پچیس ہی سال ادھر آبرو باختہ بیسواؤں کے ساتھ مخصوص تھے، اب بڑی بڑی شریفوں اور شریف زادیوں کی علامتیں قرار پا چکی ہیں۔ غرض یہ کہ شریف زادیاں اپنی بے عصمتی کے عام کرنے میں اب بڑی سی بڑی بازاریوں سے بھی پیچھے نہیں ہیں۔

ادبیات کی طرف رُخ کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ افسانہ کی ہیروئن، اب وہ معصوم بھولی، پارسا لڑکی نہیں ہے، جو وکٹوریہ کے زمانہ تک تھی۔ اب وہ وہ ہے جو آوارگی سے خوب ذوق رکھتی ہے۔ وہ تلاش لطف میں نکلی ہے اور خوش وقتی کا حصول اس کا مقصد زندگی ہے۔ سینما کے پردہ پر جو بھی طلاقن، جو بھی زانیہ، دکھائی جاتی ہے، عملاً بیسوا ہی ہوتی ہے، سینما کی غایت ہی ایسی عورت کو اچھالنا ہے، جو لذت کی طلب میں، شہرت کی طلب میں، دولت کی طلب میں، اپنی عصمت کا سودا پوری بے حیائیوں کے ساتھ کرے۔

یہ ساری آزادیاں، یہ مردوں کے ساتھ اختلاط، یہ جدید رقص، ان سب نے مجموعاً و منفرداً عورت کے جذبۂ شہوانی میں وہ زبردست تحریک پیدا کر رکھی ہے، جس کی مثال بن بیاہیوں میں، پچھلے زمانہ میں تو ملتی نہیں۔ یہ ممکن کیسے ہے کہ آپ مردوں ورعورتوں کو ایسی صورتوں کے ساتھ اکٹھا کریں، کہ اگر فیشن کا زبردست حصار نہ ائم ہوتا تو یقیناً قانون فوجداری کی دفعات عائد ہو جاتیں اور پھر اس اجتماع کے باوجو ونوں جنسوں میں سوئے ہوئے فتنے بیدار نہ ہو جائیں۔ کوئی انسانی جبلت، شہوانی شلنت نہیں۔ وکٹوریہ کے عہد تک یہ محض تعلیم، تربیت، ماحول، ماں باپ کی نگرانی غیرہ کا اثر تھا۔ جو لڑکیاں جنسی معاملات میں اس قدر بھولی بھالی رہتی تھیں، اور اپنے

شوہروں کے پاس پہلی رات گزارنے کے قبل جانتی بھی نہ تھیں، کہ زن وشو کی یکجائی میں ہوتا کیا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ لڑکیاں ابھی اسکول بھی نہیں چھوڑنے پاتیں کہ جنس اور عشق سب سے واقف ہو جاتی ہیں۔ کالج کی لڑکیاں تو کہنا چاہیئے کہ سب ہی، اور اسکول کی لڑکیوں کی اکثریت، اگر پورے عمل زوجیت سے نہیں تو اس کے بیشتر حصہ سے تو واقف ہی ہوتی ہیں۔

اور یہ نہ ہو تو ہو کیا۔ کنواری لڑکی کو جب جنسی معاملات میں معلومات اتنی حاصل ہو جائیں کہ اس کی نانی، دادی بھی حیران رہ جائیں، اور جوش وشوق اتنا پیدا ہو جائے جو پہلے صرف خوش نصیب شادی شدہ بیویوں کا حصہ سمجھا جاتا تھا، اور ساتھ ہی یہ بھی اطمینان ہو کہ گزر بسر کے لئے کسی مرد کا دامن پکڑنے کی ضرورت نہیں، تو شادی کی اہمیت تو روز بروز گھٹ ہی جانی چاہیئے اور کم ازکم اس کی عجلت تو رہنی ہی نہ چاہیئے، شوق پورا موجود، جوش پورا موجود، اب آخر کیوں شوق کو پورا کرنے کے لئے تیس سال کی عمر کا انتظار کیا جائے؟ کیوں نہ اس دوشیزگی سے فوراً دست برداری اختیار کرلی جائے جس کی اب کہیں قدر و پرسش نہیں؟ اور کیوں نہ لطف اندوزی ولذت گیری کے سارے مقامات طے کر لئے جائیں؟ آخر وہ کیوں اور کب تک اپنا دل مارے رہے؟ وہ کیوں نہ سارے مزے لوٹے، جو بقول ناولوں کے، بقول ڈراما کے، بقول سینما کے، ساری دنیا لوٹ رہی ہے، جنس متقابل کے ساتھ یا اپنی ہی جنس کے ساتھ کیوں نہ بالآخر تجربہ کر کے، وہ اپنے مسئلے آپ حل کرلے؟

[پروفیسر مورنسن کے مقالہ کے صرف ایک حصہ کا یہ ملخص درج کیا گیا ہے اصل مقالہ اس سے کہیں زیادہ مفصل اور مطوّل ہے]

عشق وفسق آسمان پر

[ہندو علم الاصنام کا ایک باب اسٹیٹسمن مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۱ء کا ایک مقالہ جو اُردو میں اپنا لیا گیا تھا]

آسمان کے چمکدار تارے، سب کے سب دیوتا اور دیوتا زادے مدرسہ میں زیر تعلیم تھے، درسگاہ کے صدر و ناظم برہسپتی تھے۔ علم و فضل، حکمت و دانائی میں سارے دیوتاؤں کے سردار، آکاش کے کل دیوتاؤں کی گردنیں اُن کے آگے جھکی ہوئی تھیں وہ سب کے گرو تھے، سب اُن کے چیلے۔ اُن کا احترام و تقدّس سب کے دلوں میں گھر کئے ہوئے۔

شاگردوں میں سب سے بڑھ کر حسین و طرحدار چندرما (چاند دیوتا) تھا ان کی پیدائش کا طریقہ دنیا بھر سے انوکھا تھا۔ ان کے باپ برہمچاری تھے یعنی عورت سے علیحدہ رہنے والے۔ دل میں اولاد کی تمنا شدید پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی طبیعت کا یہ بھی تقاضا کہ تجرد میں فرق نہ پڑے اور عمر بھر کی ریاضت رائگاں نہ جائے۔ دعا قبول ہوئی۔ داہنی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور اس نے لڑکے کی شکل اختیار کرلی، بے ماں کا بچہ نازدوں میں پلا، دُلاروں میں بڑھا۔ کوئی روک نہ ٹوک، برہسپتی خود اسکول میں جنہیں سو تیکے کھلوتے دیکھ بہلایا کرتے تھے، پھسلایا کرتے

بچپن ختم ہوا۔ نوجوانی شروع ہوئی ایک روز دریچہ سے نگاہ اسکول کے باہر باغ کے ایک گوشہ میں گئی۔ گویا ایک سیاہ بادل کا ٹکڑا مست اور پُر کیف گھٹا۔ اِس پر

جا بجا قطرے چمکتے ہوئے، گویا سیاہ مخمل پر موتی جڑے ہوئے! ـــــ نگاہ جم گئی۔ غور اور زیادہ غور! ـــــ ارے توبہ! کیسا بادل اور کہاں کا مخمل؟ یہ تو ایک حسینہ ہے، ادھر پشت کیے، نہا دھو کر سر کے بال سکھا رہی ہے! ـــــ نوجوان اور طرحدار چندرما کے دل میں جذبات کا طوفان برپا ہو گیا۔ جس کے سر کی پشت کافی حسین، اُس کے چہرہ کے حسن کا کیا عالم ہوگا؟ اس کا جمال کیسا بے پناہ ہوگا؟

لیجئے تارا نے منہ ادھر پھیرا (تارا منڈل اسی سے نکلا ہے) حُسن و زیبائی خود اس پر نازاں۔ تابش جمال نے نگاہ خیرہ کر دی! ـــــ تارا، چندرما کے آغوش شوق سے رہ کر کہاں رہ سکتی تھی؟ اور کون اُسے دور رکھ سکتا تھا؟ ـــــ لیکن نہیں، تارا کوئی ناکتخدا چھوکری نہیں، وہ شادی شدہ خاتون ہے۔ برہسپتی کی بیوی! چندرما کے مقدس گرو کی حرم محترم سن میں کم سہی لیکن رشتہ میں چندرماں سے بہت بڑی تھی۔

ہوا کرے عشق کب اُن رکاوٹوں کا قائل رہا ہے اور عشق بھی جب دیوتا کے دل میں موجزن ہوا! ـــــ دن گزرے، وقت گزرا۔ آخر ایک روز رات کے وقت اپنے خفتہ بخت شوہر کو سوتا چھوڑ، تارا نکل کھڑی ہوئی۔ دروازہ پر چندرما منتظر۔ دونوں ہوا ہو گئے۔ ساری فضائے آسمانی کو طے کرتے ایک دور بہت دور کے ستارے میں پہنچے۔ وہیں اس محبوبہ کے لئے محل تیار ہو چکا تھا، ہر طرح کے سامان عیش سے لیس۔

دیوتاؤں کی دنیا میں چرچا پھیلا۔ دیویاں حیران، دیوتا انگشت بدنداں! اس بستی میں آج تک یہ اندھیر نہیں ہوا تھا۔ چیلا اپنے مقدس گرو کی ناموس محترم کو لے اڑے یا فضائے نور پر اندھیرا چھا گیا! برہسپتی خود بھی اپنی بیوی کا عاشق زار تھا، فلسفیانہ متانت کے بعد چندرما کے پاس پہنچا اور بولا "تیری حرکت جتنی جا بیجا سہی، بس تجھ سے انتقام نہیں لیتا۔ تو آخر میرا چیلا ہے صرف اتنا سوال ہے کہ میری چیز مجھے واپس کر دے"! عاشق کے دل میں اتنی گنجائش کہاں تھی؟ پھر قوت کا زعم مستزاد، آسمانی

ہستیوں میں کس کی اتنی مجال ہے کہ مجھ سے میری محبوبہ کو جدا کر سکے! گروجی دھتکار کر واپس کر دیے گئے۔ برہسپتی جی اپنے آشرم کو واپس آئے۔ اور اب دماغ انتقام کی تدبیروں پر لڑنے لگا۔ استغاثہ اِندر کے دربار میں حل کر کرنا چاہیے۔ بارش اور ابر کا دیوتا، وہی سب سے پُر قوت ہے۔ اُس میں اتنی قدرت ہے کہ چندرما کے غرور کو شکست دے سکے اور چندرما سے اُس سے پُرانی چشمک بھی تو ہے، یہ چشمک اِس وقت خوب کام آئے گی۔

فکر اور عمل کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ اِندر دیوتا نے فریاد سنی، اور چندرما کے نام فرمان بھیجا کہ حق حقدار کو واپس کر دے۔ جواب انکار سے ملا۔ فرمان رد کر دیا گیا اور اب لڑائی کی ٹھن گئی —— اِندر دیوتا کا جاہ و جلال بالکل ظاہر تھا۔ اُس کا اقتدار سب سے اعلیٰ تھا پھر مطالبہ بھی اُس کا تمام تر حق پر تھا۔ لیکن اُدھر چندرما بھی اکیلا نہ تھا۔ زحل و مریخ اس کے داہنے بائیں بازو تھے اور تاروں کی جتنی دیویاں ہیں، سب کا جُھرمٹ اُس کے جلو میں۔ آخر تارا دیوی ان سب کی ملکہ تھی نہ! دیوتا بھی سب ہمیشہ دیوتا ہی تھوڑے ہی تھے، بہت سے انسان رہ چکے تھے، اور ریاضتوں کے بعد دیوتاؤں کی صف میں شامل ہوئے تھے اور جب بشر کے قالب میں تھے، بشری جذبات کے کھیل خوب کھیل چکے تھے —— پہاڑ پہاڑ سے ٹکرائے، زمین تھرائی آسمان لرزا۔

لڑائی نہ اب ختم ہوتی ہے نہ جب۔ رب الارباب کو غصہ آیا کہ حق و انصاف کی فتح میں اتنی تاخیر! لشکریوں کی جانیں کیوں جائیں، تنہا چندرما اصل مجرم ہی کا فیصلہ دست بدست لڑائی سے نہ کر دیا جائے! شیو جی (موت و ہلاکت کے خدا) نے اپنا سب سے زیادہ مہلک حربہ برہمتر پھینک کر مارا۔ چندرما نے اس کا جواب اُسی درجہ کے حربہ سومستر سے دیا! —— کائنات کی بنیادیں ہل گئیں!

برہما جی (خالق کائنات) اب اپنے مراقبہ سے چونکے، گھبرائے غضب ہو گیا! یہ تو میری ساری محنت ہی پر پانی پھرا جا رہا ہے! میرا کیا کرایا برباد ہوا جا رہا ہے۔

میری پیدا کی ہوئی خلقت فنا ہوئی جارہی ہے! اور یہ چندرما ہے میرا پوتا تو کیا ہوا، بڑا ناہنجار نکلا۔ پہلے اپنے گرو جی پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر ڈھٹائی کے ساتھ اپنے سے بڑوں کے مقابلہ پر نکلا، اور اب میرے برابر کے دیوتا، میرے شریک وسہیم شیو جی سے ٹکر لے رہا ہے! او ناشدنی! تجھے شرم نہیں آتی۔ اپنے دادا کے مقابلہ میں صف آرا ہو رہا ہے! بس اب تیری خیر اسی میں ہے کہ اپنے گرو کی چیز اُسے واپس دیدے جان تیری اسی طرح بچ سکتی ہے۔ باقی اب تک جو تو جرائم کر چکا ہے، اُس کی سزا یہ ہے کہ آج سے ہر تیدرہویں دن چہرہ کی روسیاہی تیرے نصیب میں رہا کریگی!

لڑائی ختم ہوگئی۔ اور ختم یوں ہی ہونی تھی۔ چندرما کا دل اب تارا سے اُکتا چکا تھا۔ عاشقی کے جذبات فنا ہو چکے تھے۔ بیوی شوہر کے پاس واپس آئی، اور چند ہی روز بعد ایک لڑکا جنی، زر و لباس میں ملبوس، انسان کی شکل کا خوب گورا چٹا مضبوط اتنا کہ کسی کے مقابلہ میں مغلوب ہونا جانتا ہی نہیں۔ صورت بالکل چندرما سے ملتی ہوئی۔ ولدیت اُسی کی تسلیم ہوئی۔ ماں جواب دیتے ہوئے شرمائی، لجائی ——— لڑکے کا نام باپ نے بُدھ رکھا۔ زمین پر ایک سلطنت اُسے حکومت کے لئے عطا ہوئی۔ قوت تسخیر کا یہ عالم کہ ہاتھی اس طرح پیچھے پیچھے پھرتے، گویا کوئی کتا دُم ہلاتا ساتھ ساتھ ہے! ———

دیوتاؤں نے کہا، کہ بیا بیا عراقی تو ازاں خاص مائی!

یہ تو ہم میں شامل ہونے کے قابل ہے، اسے زمین سے آسمان پر اٹھالو۔ برہما جی نے حکم دیا، کہ آج سے اس کا شمار بھی آسمان کے دیوتاؤں میں ہو۔ عطارد ستارہ کو آپ پہچانتے ہیں؟ یہ وہی ماہتاب زادہ ہے!

خود چندرما جی بھی اپنے گرو کی بددعا کے اثر سے نہ بچے، دق کا مرض مسلط ہوگیا گنگا مائی کے کنارے آ، ہردوار کے قریب، ریاضتیں کرنی شروع کیں۔ مہادیو جی اس کفارہ سے راضی ہوگئے، حکم ہوا، بیماری دور ——— گنگا جی کے کنارے رشی کیش میں چندریشر کا جو متبرک مندر ہے، یہ تیرتھ اسی مقدس واقعہ کی یادگار ہے!

ایک بزمِ مُشاعرہ
(کی)
غیر شاعرانہ صدارت

(لکھنؤ دفتر حق وصدق میں ۶ و ۷، مارچ کی درمیانی شب میں ایک محفل مشاعرہ، شوکت تھانوی صاحب ایڈیٹر رسالہ کائنات اور ملک کے مشہور مزاحیہ نگار کی دعوت پر منعقد ہوئی۔ صدر محفل ایک نااہل کو بنا کر بٹھا دیا گیا۔ اُس نے اپنی بے کمائی کا مظاہرہ الفاظ ذیل میں کیا)

بزم مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اُس کا صدر ایک دیہاتی! اور دیہاتی بھی کیسا زبان وادب کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر وسخن کے باب میں محض غبی! داد بانیٔ مشاعرہ کی خوش طبعی کی دیجئے۔ سبحان اللہ! کیا خوب نظر انتخاب پڑی ہے! ان کی علمی ظرافت سب پر روشن وآشکار۔ لیکن حقیقت آج کی عملی ظرافت اس کا شاہکار، دنیا کی نظر میں وہ محض ایک ظریف، لیکن آج کے صدر مشاعرہ کے حق میں ستم ظریف! یہ صدارت کیا ہے قحط الرّجال بلکہ نیرنگی دہر کا ایک کھلا ہوا نشان اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانہ کا گمان! بلکہ یوں کہیئے کہ فسانہ عجائب کا کوئی ظریفانہ ایڈیشن اگر صاحب "کائنات" کی سرپرستی میں زیر طبع ہو تو اس کے لئے موزوں عنوان!

صدر اور صدارت کا نام آتے ہی ذہن منتقل ہوتا ہے "خطبۂ صدارت" کی جانب بلحاظ ضخامت طویل وعریض، بلحاظ ادب وانشاء فصیح وبلیغ وبلحاظ معانی ومطالب عمیق، اور بلحاظ تحقیق فن دقیق۔ سامعین مطمئن رہیں کہ اس قسم کی بحر طویل میں کوئی غزل اُن کی خدمت میں پیش کی جائے گی اور نہ دو چار منٹ سے زائد انہیں تکلیف دی جائے گی،

نہ شاعری کی اہمیت پر ہومر اور کالیداس کے حوالوں سے کوئی محققانہ تبصرہ، اور نہ اردو شاعروں کا ولی دکھنی کے وقت سے شروع کرکے کوئی ناقدانہ تذکرہ! یہ مختصر سی سامعہ خراشی جو کیجا رہی ہے، وہ بھی محض اس ارشاد کی تعمیل میں، کہ خطبۂ صدارت کے نام سے کچھ نہ کچھ ہو ضرور ـــــ گویا یہ بھی کوئی فرض ہے کہ بلبلوں کی نواسنجیوں سے قبل کچھ دیر زاغ و زغن کی نوائے بے ہنگم سے بھی لطف اٹھالیا جائے۔

یاران بزم! محفل مشاعرہ اور تقویم مسیحی کی بیسویں صدی! اردو شاعری کی پرانی دُھرانی بزم! اس ترقی و تجدد کے زمانہ میں! یہ وقت ہے سینما کا، تھیٹر کا، آپراہاؤس کا، گراموفون کا، ریڈیو کا، ٹاکیز کا، میوزک ہال کا، کارنیوال کا، یا آپ کے فن عروض کا، قصائد حمد و نعت کا، منقبت کا، مناجات کا! آپ کے مشاعرہ غریب کی پُرسش آج ہے کس دربار میں؟ آپ کے شاعروں کے لئے عزت کی کرسی اس وقت ہے کس سرکار میں؟

مشرق کے خلاف جو بغاوت خود مشرق سے کرائی گئی ہے اور آپ کے گھر میں جو آگ گھر والوں کے ہاتھ سے بھڑکائی گئی، وہ ناتمام اور ادھوری رہ جاتی۔ اگر اس کا رُخ مشرقی شاعری کے بھی خلاف نہ ہوتا۔ آپ باغی بنائے گئے۔ اپنے آباواجداد سے، اپنی تہذیب و معاشرت سے اپنی وضع و لباس سے اپنے علوم و فنون سے، اپنے دین و اخلاق سے، اور اگر سب سے بڑھ کر نہیں تو اور کسی شعبۂ زندگی سے گھٹ کر بھی نہیں اپنے شعر و ادب سے! آپ کی شاعری فرنگیت کے پیمانہ سے نپنے لگی۔ اسی میزان میں تُلنے لگی؛ اور فیصلہ یہ صادر ہوگیا کہ اردو شاعری میں رکھا کیا ہے؟ بجز ہزل اور تخریب اخلاق کے اس میں ہے کیا؟ ـــــ گویا بائرن انگریزی کا نہیں اردو کا شاعر ہوا ہے اور شکسپیر نے "لکریشیا" فرنگستان میں نہیں، دہلی یا لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھی ہے۔

مکالے، اور مکالے کے بعد آنے والوں نے ہمارے ادب سے متعلق جو گہر افشانی کی ہے، کیا ہم اُسے بھول گئے ہیں؟ اور آہ کہ ان بیگانوں کے ساتھ اپنوں کی بھی زبانیں جس طرح اپنی زبان، اپنے ادب، اپنی شاعری پر کھلی ہیں اُسے ہم بھلانا چاہیں بھی تو کیونکر

بھلا سکتے ہیں؟

آج جبکہ نہ دلّی کی سرکار ہے، نہ اودھ کا دربار، اور شاعروں کی قدر اتنی بھی نہیں جتنی ناٹک کے گویّوں اور سینما کے بھانڈوں کی ہے، آفریں ہے آپ کی ہمت پر جو اب بھی آپ میر تقی میر اور خواجہ میر درد کی یاد کو سینہ سے لگائے، کلیجہ سے چمٹائے ہوئے ہیں، اور بجلی کے قمقموں کے دَور میں اپنی شمع کافوری جلائے ہوئے ہیں!

حقائق و معارف کی ترجمانی، ہر ہر دور میں فارسی شاعروں اور اردو شاعروں سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ شاعروں سے مراد جماعت کے حقیقی باکمال افراد ہیں، ورنہ ننگ جماعت افراد کس طبقہ میں نہیں ہوتے؟ کون ایسا چمن ہے جس میں گلُ بغیر خار کے ہوں؟ آپ کے فخر کے لئے آپ کے بلند پایہ اسلاف معنوی کے کارنامے کافی ہیں، بلکہ کافی سے بڑھ کر وافی کوشش کیجیے کہ ہر قدم انہیں کے نقش قدم پر پڑے، بلکہ ممکن ہو تو حقیقت سنجی میں، حقیقت بینی میں، حقیقت گوئی میں، ان سے آگے بڑھ بڑھ کر رہے۔ اور اوراق لیل و نہار پر اپنی یہ تاریخ ثبت کرا جائیے کہ آپ کے ہاں فیضیؔ اور عرفیؔ اس وقت بھی برابر پیدا ہوتے رہے، جب دربار اکبری مدت ہوئی برخاست ہو چکا تھا!

غالبؔ کا فلسفہ

[لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشریہ۔ ۱۶ر فروری ۴۲ء کو غالب کی برسی کے موقع پر]

فلسفہ کے نام سے گھبرائیے نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے ناماموس لغات کا، ثقیل، مغلق اصطلاحات کا نام نہیں۔ فلسفہ نام ہے خودشناسی کا۔ زینہ ہے خداشناسی کا۔ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ ہمارے گردوپیش کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ عادات واطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں، جن سے ہم کو آپ کو سب کو دوچار ہونا پڑتا ہے کبھی جان کر، اور کبھی انجان۔ انھیں کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجیے اور لیجیے آپ فلسفی ہوگئے پھر غالبؔ غریب، کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں۔ ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی باتیں کرتے تو ذرا گہری۔ نظر سطح کی نہیں، عمق کی عادی۔ چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں، مغز تک پہنچ جانے کے خوگر۔ سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں، اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے، تو کبھی پیاری نثر میں، کبھی دلآویز نظم میں، کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے، کبھی نثر کے مائکروفون کو منہ لگا لیتے۔ شہرت شاعری کی بہ زیادہ ہوگئی، ورنہ تحقیق کی زبان سے تو روایت یہ سننے میں آئی ہے کہ نظم ونثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے،

نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت، کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا، جب چاہا ہنستوں کو رُلا دیا۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا۔ مُرجھائے دِلوں کو کھِلا دیا! فطرت بشری کے راز دار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی۔ معنویت کے بول لطافت وظرافت کے سروں میں الاپتے۔ ابھی آہ کا رنگ جما دیا، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا۔ یہی اُن کی حکمت، یہی اُن کا فلسفہ۔ یہی اُن کی شاعری کا پیام، یہی اُن کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لے کر آئے تھے اور دماغ بیدار۔ شعر کمسنی ہی سے کہنے لگے تھے، جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا آخر تک رہا۔ جوں جوں سِن بڑھتا گیا، پختگی آتی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے حقیقی کا نقش شروع ہی سے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ جوانی کا زمانہ رندی و سرمستی کا ہوتا ہے۔ جھومتے جاتے ہیں، لیکن اس بیہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں ؎

قطعِ سفرِ ہستی و آرام فنا ہیچ — رفتارِ نفس بیشتر از لغزش پا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا — سامان دوا وحشت و تاثیر دوا ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی، لیکن خیال کی ندرت، طبیعت کی جدت اس نومشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مہینے کا نیا چاند ہم آپ سب ہی دیکھتے ہیں۔ لیکن حضرت غالب کا دیکھنا ہی کچھ اور تھا۔ حکیمانہ نظر نے دیکھا اور نکتہ پیدا کیا کہ چودھویں کا جو اتنا بڑا اطباق سا چاند ہوتا ہے، وہ آخر پیدا ہوتا ہے اُسی منحنی، کم رو، اور خیال کی طرح نازک و باریک ہلال سے۔ گویا کمال کی بنیاد، ضعف و اضمحلال ہی سے پڑتی ہے۔

بدر ہے آئینہ طاقِ ہلال — غافلاں! نقصان سے پیدا ہے کمال

مذہب کے تعدد سے، ظاہری رسوم کی سختیوں سے، اور فریقانہ غلو سے تنگ آکر کہتے ہیں، کہ سکون خاطر منظور ہے، تو بس توحید سے لو لگا لیجیے،

وحدت کی خانقاہ میں کنج نشین ہو جائیے، اور یک داں، یک بیں، یک گو بن کر رہ جائیے ؎

تا چند ناز مسجد و بتخانہ کھینچیے — جوں شمع دل بخلوت جانانہ کھینچیے

کائنات سے انسان سبق لینا چاہے، تو ذرہ ذرہ سبق دینے کو تیار ہے۔ اس میں تاج محل اور فقیر کی جھونپڑی کی تفریق کیسی؟ حقیقت شناسی کی آنکھ کے لیے بجلی کا قمقمہ اور مٹی کا دیا دونوں ایک ہیں۔ فطرت کی مشاطہ صنعت و ربوبیت کی کنگھی دست قدرت میں لیے مانگ چوٹی ان کی بھی درست کرتی ہے۔ اُن کی بھی۔ اسی مضمون کو کہیں یوں ادا کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور کہیں ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موتی کی قدر و قیمت سب جانتے ہیں، یہ فطرت بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے، لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اسے حضرت انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں اور باہر اُسی وقت نکالتے ہیں، جب چوٹ پڑ لیتی ہے، دل پر نہ سہی، کم از کم جسم ہی پر سہی، سلسلۂ موجودات میں جس کا جیسا ظرف، ویسا ہی اُس کا مرتبہ ؎

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ بشر کے گناہ بیشک بے حد و بیشمار۔ لیکن فطرت میں جو قدرتِ عصیاں، میلانِ فسق، طاقت گناہ رکھ دی گئی ہے، وہ تو اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ انسان گناہ کہاں تک کریگا، جتنے بھی کریگا، پھر بھی بہت سے چھوٹ ہی جائینگے، کر سکتا ہوگا، مگر کریگا نہیں۔ پھر کیا جب وقت جزائے کامل کا آئیگا، تو عادل حقیقی کی کریمی بندہ کی اس بناوٹ کا لحاظ بھی نہ رکھیگی؟ اس مضمون کو کئی کئی طرح ادا کیا ہے۔ کہیں یوں ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اور کہیں یوں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور کہیں یوں بھی ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رات کو شبنم پڑتے ہم نے آپ نے سب نے دیکھا ہے چمن کی زمین بھیگی پڑی ہے کہ صبح آفتاب نکلا، اور اُس کی کرنوں کے ساتھ وہ ساری نمی رخصت اس منظر پر بھی کبھی کبھی نظر پڑی ہو گی۔ غالب کی نظر اس پر بھی گڑ گئی۔ آفتاب کا کام تو زندگی دینا ہے، نشو و نما بخشنا ہے، اور بعض قدیم فلاسفہ کا مقولہ ہے کہ شبنم پیدا بھی آفتاب ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن اِدھر کرن پھوٹی، اُدھر شبنم کا وجود بھی رخصت ہوگیا کل نے جزو کو اپنی طرف کھینچ لیا، اپنے میں جذب کرلیا۔ ظاہر میں فنا اور واقعتہً بقا حاصل ہوگئی، اور کہنے ہیں فلسفۂ وحدت وجود کے اندر گم ہوکر کہتے ہیں، کہ یہی حال انسان کا ہے۔ ممکن الوجود کی تو عین تمنا یہی ہے کہ واجب الوجود اُس پر توجہ کرے۔ اُس پر تجلیِ رحمت کا عکس ڈالے، اور اُسے اپنے اندر جذب کرلے ——— بندہ کا وجود یوں بھی تو مالک کے سامنے بمنزلۂ عدم کے رہتا ہے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم   میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اور پھر یہی شربت ایک دوسرے گلاس میں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے   کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مخلوق کا وجود تو خود اس کی فنا کی دلیل ہے۔ وجود نہ ہو تو فنا کا عمل ہو کس چیز پر؟ مرزا فرماتے ہیں کہ بجلی کا گرنا تو سب نے دیکھا، یہ بھی دیکھا کہ بیچارے دہقان کی کی کرائی محنت سب دم بھر میں غارت گئی، اور جو غلّہ کا انبار تھا، وہ راکھ کا ڈھیر ہوکر رہ گیا۔ لیکن دہقان ہی نے تو آخر دوڑ دھوپ کرکے اس آفت کا محل تیار کیا تھا۔

اس آگ کے لیے مسالہ فراہم کیا تھا۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

فنا کا رنگ حضرت غالب پر شروع سے غالب رہا۔ شوخیوں اور رنگینوں کے درمیان غالب رہا، رندی اور آزاد مشربی کے باوجود غالب رہا۔ کہیں کہیں تو یہ لَے ہلکی ہے۔ دھیمے سُروں میں کہتے ہیں ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے　　بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ مستقبل کا صیغہ حال سے بدل گیا ہے۔ اور صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے، اس کاروبارِ حیات کی مثل طلسمات نمود ہے، حقیقۃً معدوم اور صرف بہ ظاہر موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا، بارکلے کے نام کا گزرا ہے، وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

ان کھائیو مت فریبِ ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سربسر　　کبتک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی!

اور پھر کہتے ہیں، اور فلسفہ کی خشکی میں شاعری کی رنگینی پیدا کرکے کہتے ہیں ؎

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید یہی مضمون سب سے زیادہ نکلے۔ خدا جانے کتنے مختلف طریقوں سے اسے پیش کیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ محض قال نہ ہو حال ہو۔

زندگی کی تلخیوں کے تجربہ نے معتقد اس کا بھی بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ جب تک کہ انسان اس آب و گل کی دنیا میں ہے، کچھ بھی کرے یہ جھگڑے بہرحال اس کا ساتھ چھوڑنے

کے نہیں ۔ مرزا کی آپ بیتی اُن کی ذاتی نہیں، نوعِ بشر کی آپ بیتی ہے ۔ لیکن شعر کے موزوں سانچے ہیں، لطیف قالب میں ادا تو اُنھیں کی زبان سے ہو رہی ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہی مفہوم، ردیف و قافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور یہ عدم ہستی نما جو کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے، اُس کی بھی بساط کیا، اور پائداری کتنی؟ ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل　　گرمیِ بزم ہے بس رقصِ شرر ہونے تک!

بعض ادنیٰ فلسفیوں اور ناقص قسم کے زاہدوں کو دیکھا ہوگا کہ خلق سے اپنے آپ کو گویا بالکل علیحدہ کر لیتے ہیں، اور ترک و تجرید کے معنی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں اور باپ، بھائی اور بہن، ہمسایہ اور ہموطن، کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں ۔ غالب کی اصطلاح میں اس کا نام "وحشت ہے" اور اُن کا فرمانا ہے کہ اس وحشت کا مستحق تو خود اپنا نفس ہے، نہ کہ دوسرے ؎

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں　　اپنے سے کر نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

حسد کا علاج اکثر حکمائے اخلاق نے لکھا ہے ۔ مرزا صاحب کی تشخیص ہے کہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے تنگ نظری سے ۔ اور اس لیے ان کے مطب میں اس کا علاج نظر کی وسعت ہے ۔

حسد سے دل ہے گر افسردہ، گرم تماشا ہو　　کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مذہب: اخلاق کی اصل اور بنیاد بہت سے حکیموں، عارفوں کے نزدیک اِخلاص ہے ۔ غالب بھی اسی مشرب کے پیرو ہیں ۔ ان کی شریعتِ شعری کا فتویٰ ہے کہ وضعداری بجائے خود قابلِ صد قدر و مستحق ہزار داد ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے　　مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بعض اہلِ باطن کا قول ہے کہ حکمتِ کاملہ کو منظور رہی جب یہ ہو کہ بندہ فلاں فلاں حدود کو توڑ دے، تو اب بندہ کا اُس سے جھجکنا اور رُک کے رہنا خود ایک معصیت اور خود بینی ہے۔ یہ مضمون اب مرزا صاحب کی زبان سے سنیے: ؎

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے　　کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

یہی مفہوم ایک دوسرے دلکش و موثر انداز میں ؎

کر رہا ہوں میں اُسے نامۂ اعمال میں نقل　　کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نا محدود کا پورا پتہ محدود کیسے چلا سکتے ہیں، اور جو مطلق ہے، اُسے کوئی مقیّد اپنی عقل و فہم کی گرفت میں کیسے لا سکتا ہے؟ یافت ہر ایک کی، بس اپنے مرتبہ کے لائق ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس حقیقت کو پایا ہے، اور ذرا دیکھیے گا کس شاعرانہ' بانکپن سے اُسے اپنے انداز میں دوہرایا ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ذات کے طالب کو بھلا تجلیِ صفات سے کب تسلّی ہو سکتی ہے؟ غالب، صوفیوں کی بتائی ہوئی، عارفوں کی سُجھائی ہوئی اس حقیقت کو دوہراتے ہیں، اور بیان میں شوخ زبانی کا پیوند لگاتے جاتے ہیں، شاید اس لیے کہ شاید سننے والے کہیں بھول نہ جائیں کہ غالب، خانقاہ کے بوریہ پر نہیں، مشاعرہ کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

عبرت کا رنگ، کلام میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ سِن بڑھتا گیا، اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ قطعہ ارشاد ہوا، سرتا سر مرصع۔ مدۃ العمر کے تجربات کا نچوڑ، سارے فلسفۂ حیات کا خلاصہ، روئیدادِ زندگانی کا لب لباب ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی | مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط | دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ | یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں | نے وہ سرود و سوز نہ جوش خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی | اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ کیا ہے گویا شاعر کا وصیت نامہ ہے۔ اس قطعہ کا زمانہ صاحبِ غالب نامہ کی تحقیق ہے، کہ ۱۸۳۶ء ہے، گویا غالب کی عمر اُس وقت کُل ۴۰ سال کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کہنا چاہیے کہ غالب عین جوانی ہی میں بوڑھوں کے ہم سن ہو چکے تھے۔

آخر عمر کے خطوط، عبرت اور فنا کے مضامین سے پٹے پڑے ہیں۔ ۱۹ رجون ۱۸۶۳ء کو یعنی اپنی وفات سے کوئی چھ سال قبل ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"روح میری اب جسم سے اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

"خرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم"

منزلِ ویراں کی ویرانی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دوسرے مکتوب میں وفات سے ساڑھے تین چار سال قبل نومبر ۱۸۶۵ء میں تحریر کرتے ہیں:۔

"نمایش گاہِ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمایش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا۔ اب عالمِ بے رنگی کا مشتاق ہو کر۔ لا الہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ"

آخری زمانہ کے خطوط میں عموماً اپنا نام خاتمہ پر یوں لکھتے ہیں "نجات کا طالب، غالب"، "مرگِ ناگاہ کا طالب، غالب"۔ اور ایک آخری خط کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:۔

"زندہ ہوں، مُردہ نہیں۔ بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس،
قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار،
مرگ کا امیدوار، غالب"

جوانی میں کبھی یہ شعر کہا تھا۔ زبانوں پر آج تک چڑھا ہوا ہے، اور معنی خدا معلوم کیا کیا لیے جا رہے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت غالبؔ
دل کے خوش رکھنے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

اردو کے اس بہترین غزل گو کی زندگی بجائے خود ایک غزل تھی، اور اس غزل کا مطلع آپ نے ابھی سُن لیا ہے۔ اب مقطع بھی سُن کر فاتحۂ خیر کے لیے ہاتھ اُٹھا دیجیے۔ حالیؔ کی روایت ہے کہ آخر وقت بار بار اپنے اس شعر کو پڑھا کرتے ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

صوبہ کا مسلمان حکمراں

۱۴ اپریل کے سہ پہر کو آنکھوں نے جو موثر منظر دیکھا، وہ عرصہ تک بھولنے والا نہیں۔ مسجد دارالعلوم ندوہ کے سنگ بنیاد نصب کرنے کی تقریب تھی اور بنیاد رکھنے والے نواب صاحب چھتاری تھے۔ جب ارکان ندوہ نے یہ طے کیا تھا، اُس وقت نواب صاحب گورنر نہ تھے، اور نہ ارکان ندوہ کو ان کی گورنری کا خیال تھا، جب تاریخ موعود آئی، تو اس درمیان میں نواب صاحب صوبہ کے گورنر مقرر ہو چکے تھے، اور کئی دن ہوئے گورنری کا باضابطہ چارج بھی لے چکے تھے۔ ندوہ گورنمنٹ سے "ایڈ" لے رہا ہے، اور دارالعلوم کا سنگ بنیاد بھی سر جان ہیوٹ (لفٹنٹ گورنر) کا رکھا ہوا ہے، اس لیے مسجد ندوہ کا سنگ بنیاد اگر مسلمان گورنر رکھتے، تو خلافِ توقع نہ تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر صوبہ کے گورنر سے نہ کوئی استدعا کی گئی، نہ گفتگو ہوئی تھی، جو کچھ بھی طے ہوا تھا، وہ شخصاً نواب صاحب موصوف سے ہوا تھا، اور یہ بالکل اتفاقی بات تھی، کہ وہ عین وقت پر صوبہ کے حکمراں بھی تھے۔

ٹھیک سوا پانچ پر آمد تھی۔ آگے آگے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی موٹر سائیکل، پیچھے کچھ فاصلہ پر ہز اکسلنسی کا موٹر۔ ہم دس بارہ آدمی (ارکان انتظامیہ ندوہ) برآمدہ میں استقبال کے لیے صف بستہ، موٹر رکا، آگے اور پیچھے انگریز پرائیوٹ سکرٹری اور انگریز ایڈیکانگ۔ درمیان میں توقع تھی، اور توقع سے گزر کر یقین تھا، کہ انگریز نہ سہی، انگریز نما، گورنر ہوگا ــــــ توقع پوری نہ ہوئی، اور

یقین باطل نکلا ۔

نہ انگریزی ہیٹ، نہ انگریزی سوٹ۔ سر پر معمولی ترکی ٹوپی، جسم پر معمولی شیروانی، اور معمولی سفید پاجامہ! وضع میں، لباس میں، گفتار میں، رفتار میں، انگریزیت کا کہیں پرتو تک نہیں۔ سرتاپا مشرقیت اور اسلامی سادگی کا ایک پیکر! بلند و بالا قد، جمیل و روشن چہرہ، گویا ایک تُرک، ہندوستانی لباس میں! یہ کون تھا؟ ضلع کا کلکٹر نہیں، قسمت کا کمشنر نہیں، سارے صوبہ کا حکمراں، وہ جس کے آگے کلکٹر، کمشنر، جج، اور بڑے بڑے گردن کش، گردنیں خم کرنے پر مجبور! ابصار دنگ، بصیرت متحیر، کہ اس صدی میں اور یہ منظر! ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشآء ـــــــ یہ اُس دادا کا پوتا ہے، جو اپنا وطن، اپنا خانماں، اپنی ریاست، اپنی جائداد، سب چھوڑ چھاڑ، بیت اللہ کو ہجرت کرکے چلا گیا تھا، اور وہاں سے پھر وطن آیا، تو اپنے مرشد، اور اس دور کے مرشدِ کُل، حضرت حاجی امداد اللہؒ کے حکم سے، کہ ہندوستان جاکر یتیم پوتے کی پرورش کرے ـــــــ وہی بیکس یتیم، جو آج صوبہ کی ۵ کروڑ مخلوق میں دینوی حیثیت سے سب سے زیادہ معزز و سربلند ہے!

جلسہ کا آغاز، کلام پاک کی تلاوت، قاری خوش الحان، اور رکوع بھی کونسا، واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ۔ اُس وقت کی یاد، اور اُس سماں کا تذکرہ، جب یہ گھر اور یہ مکان والے کا سب سے پہلا سب سے بڑا گھر، دنیا میں بن رہا تھا، جب سب سے پہلی اور سب سے بڑی مسجد تعمیر ہو رہی تھی، اور اُس گھر کے مزدور کون تھے، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ! پتھر پر پتھر ڈھوتے جاتے تھے، اور خدا جانے، خشیت کی کن کن کیفیات سے تڑپ تڑپ کر، کس کس طرح رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر، دعائیں بھی مانگتے جاتے تھے، کہ ربنا تقبل منّا، انّک انت السمیع العلیم ۔ حضور والا، یہ ہماری حقیر نذر قبول بھی فرمالیں، کہ آپ ہماری زبان سے نکلی ہوئی التجائیں بھی سُن رہے ہیں، اور ہمارے دلوں کی حالت بھی آپ پر خوب روشن ہے! ـــــــ اہل دل ہیں سے

کون تھا، جو یہ منظر یاد کر کے بھی دل پر قابو رکھ سکتا ؟

اور قاری سے منتصل، بندوں کی طرح سر جھکائے، اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے، کھڑا کون تھا ؟ یو، پی کا گورنر، ۴ کروڑ ۹۶ لاکھ انسانوں کی قسمت کا مجازی مالک، اس لق و دق صوبہ کا حکمراں، جو آبادی میں اٹلی سے، فرانس سے، اور خود برطانیہ سے بھی بڑا ہے! وہ احمد سعید خاں جس کے سینہ میں خود بھی قرآن محفوظ ہے، جس نے دس سال کی عمر سے، آج تک شاید کسی رمضان میں بھی قرآن سنانا ناغہ نہیں کیا، جس نے منسٹر ہو کر قرآن سنایا، ہوم ممبر رہ کر قرآن سنایا، اور جو راونڈ ٹیبل کانفرنس کو چھوڑ، لندن سے ہندوستان چلا آیا، کہ قرآن سنانے کے معمول میں فرق نہ آئے! ——— اہل تقریب میں سے کون تھا، جو اس منظر سے غیر متاثر رہتا ؟

ایڈریس پڑھ کر سنایا گیا۔ اس معمولی رسم کے اندر چھپی ہوئی، لیکن چھپی ہوئی غیر معمولی حقیقت یہ بھی تھی، کہ

> "تعمیر مسجد کے ثواب کی عظمت اظہر من الشمس ہے، من بنیٰ للّٰہ مسجداً بنی اللّٰہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ ...... ہم بہ صد خشوع دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور اُن تمام بزرگوں کو جنھوں نے اس کار خیر میں اعانت فرمائی ہے، اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے"

کسی گورنر کو آج تک اپنے ہاں بُلا کر، حدیث رسول سُنائی گئی ہے! کس کی قسمت میں عالموں کی زبان سے مرضیات الٰہی پر چلنے کی دعا سننے میں آئی ہے ؟

جواب اڈریس میں لکھنؤ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، آگرہ یونیورسٹی کے چانسلر، اور مسلم یونیورسٹی کے رکٹر کی زبان سے یہ الفاظ، خدا جانے کتنی روحوں میں تازگی اور بالیدگی، اور کتنے قالبوں میں افسردگی اور پژمردگی کا سبب بنے ہونگے:-

> "ایک ایسی علمی درسگاہ میں جیسا کہ آپ کا ندوۃ العلماء ہے،

طلبہ کی ذہنی اور دماغی بالیدگی کے ذرایع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ
اُن کی روحانی نشوو نما کا سامان بھی مہیا کرنے کی سخت ضرورت ہے،
اور کون انکار کرسکتا ہے کہ اُس عبادت گاہ کے سوا جس کا سنگِ بنیاد
نصب کرنے کے لیے آپ نے مجھے یہاں طلب فرمایا ہے، کوئی اور
دوسری چیز ہوسکتی ہے، جو اس خیال کو تکمیل کے ساتھ پورا کرے۔"

عین بنیاد رکھنے کے موقع پر صرف ارکان انتظامیہ، مع گورنر کے اسٹاف کے دو انگریزوں کے موجود تھے۔ نماز عصر کا اوسط وقت تھا۔ آفتاب کی تابش مدھم پڑ چلی تھی۔ پتھر نصب کر چکنے کے معاً بعد، دنیا کے اسی بڑے حاکم کی زبان، احکم الحاکمین کے حضور میں کھلی، اور قبلہ رُخ ہوکر، ذیل کے مختصر بول، بغیر کسی تیاری اور تمہید کے، تصنع سے پاک اور تکلف سے بری، حلق سے نکل، فضا میں گونجے:۔

"اے پروردگار، یہ پتھر تیرے گھر کا تیرے ایک گنہگار بندہ نے
رکھا ہے، اس کے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت سے مسلمانوں کو
توفیق عطا کر کہ اس گھر کو آباد رکھیں، تیری عبادت کریں، اور
تیرے رسول کے احکام پر چلیں۔"

گورنر کی زبان کا ایک ایک لفظ پہلے سے مرتب کیے ہوئے پروگرام کا پابند ہوتا ہے، اس دو لفظی تقریر کا پروگرام میں کہیں ذکر نہ تھا۔ سننے والوں کے دل اثر میں ڈوب کر رہ گئے، کہنے والے نے کہا کس دل سے ہوگا!

جلسہ میں میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ وقت وہ تھا، جب پروگرام کے خلاف، اور مجلس انتظامیہ کے علم میں لائے بغیر، ایک طویل اُردو نظم سُنائی گئی، جس کے ہر ہر شعر میں "گورنری" کی مبارکباد، اسی رسمی ایشیائی مبالغہ کے انداز میں تھی۔ اس قصیدہ تہنیت کا یہ کوئی محل نہ تھا۔ اور پھر واقعیت بھی ایک ایک شعر کے نیچے ذبح ہو رہی تھی۔ مبارکباد ممدوح کو دی جا رہی تھی کہ اُسے یہ منصبِ جلیل ملا۔ حالانکہ مبارکباد کے قابل خود منصبِ گورنری تھا۔ سرافرازی حقیقتہً

نواب ممدوح کی نہیں ہوئی، خود گورنمنٹ ہاؤس کی ہوئی۔ گورنمنٹ ہاؤس نے آج تک بجز لحم خنزیر کے لوتھڑوں اور شراب کی بوتلوں کے اور دیکھا کیا تھا۔ سوا ناچ اور رنگ کے غفلت کے قہقہوں اور انانیت کی بدمستیوں کے اور جانا کیا تھا؟ آج پہلی بار ہے کہ اس کے در و دیوار قرآن کی آواز سُن رہے ہیں۔ آج پہلا اتفاق ہے کہ اس کے ہال اور برآمدے اذان اور تکبیر سے گونجے ہیں۔ آج کا دن اُس کی تاریخ میں، اُس کی عمر میں پہلا دن ہے کہ اس کی زمین نے کسی کو اللہ کے آگے جھکتے اور گرتے، ہاتھ باندھتے اور سر جھکاتے دیکھا ہے! پردہ کے لیے قناتیں کھڑی ہونا، خلیل اللہ کی سنت کی اتباع میں قربانی کا خون گرنا، آج سے قبل کیا اُس کے نصیب میں آیا تھا! سربلندیاں مکین کو حاصل ہوئیں یا مکان کو!

آج عمر بن عبدالعزیزؒ کیا معنی، اورنگ زیب عالمگیرؒ کا بھی زمانہ نہیں، آج تو وہ وقت ہے کہ "صاحب" کی عدالت کے چپراسی اور پیادے تک اسلام پر مضحکہ کرنے کو تیار رہیں۔ دین کی اس بے بسی کی گھڑی میں، یا جو جیت کے اس نرغے میں، مبارک ہے وہ جو اتنے بڑے مرتبہ پر پہنچ کر بھی اپنے کو نہ بھولا، اپنے مالک و مولا کو نہ بھولا، اپنے کو بندہ سمجھا، جب تک جیا، اپنی بندگی ہی پر فخر کرتا رہا، اور جب وہ وقت آئیگا، جس سے مفر نہ گورنروں کو ہے نہ وایسراؤں کو، نہ بادشاہوں کو، نہ شہنشاہوں کو، تو انشاء اللہ اپنے اللہ ہی کی گواہی دیتا ہوا اپنی بندگی ہی کا اقرار کرتا ہوا، اپنے رسول کا کلمہ پڑھتا ہوا، قرآن کی دولت کو اپنے سینے کے اندر چھپائے ہوئے وہ رخصت ہوگا!

محمد علیؒ

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی، کہ یہ شب، شبِ قیامت یا نمونۂ "شب قیامت" بھی بن سکتی ہے؟ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ ابکی اسی رات کو ان کا نصیبہ سُلا دیا جائیگا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اُسی وقت اُسے اُٹھا لیا جائیگا، جس کے وجود سے ملّت اسلامیہ کا وجود تھا، جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت، اللہ کا نام جینے والوں کی موت، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے! اس پچھلے زمانے میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اُٹھا لیے گئے، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا، انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر "اتحادیوں" کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لُٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اُڑی، مصر کا سردار اُٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا، اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دَم، ہر زخم کے لیے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے وقت، دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی، تو اسی خیال سے، کہ جو کچھ بھی چلا جائے، محمد علی تو ہم میں موجود ہے، آہ، کہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شبِ مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھِن گیا، اور جس پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لیے یہ منادی کر دی

تھی کہ ما محمدٌ اِلّا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قُتِل انقلبتم علٰے اعقابکم، اُس کے فرشتوں نے، اُس کے بندوں تک، محمدؐ کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچا دی!

اے پاک پروردگار، اے سب کے چلانے والے اور سب کے اُٹھانے والے مولا، تیرا ارادہ بیشک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلاشبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم، بنا دینے پہ قادر، لیکن کیا ہم جیسے ناتوان و کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمائش، اتنے بڑے ابتلا، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمائشیں تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہیں، ہم کم ظرف اس لائق تھے، کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل و کرم کی بھیک کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے ہوں، عین اُسی وقت، ہماری سب سے بڑی زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی، ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ اور دل چاہتا تھا، جس کی موت کی خبر کبھی نہ سننی پڑے، اُسے دَم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اور اُس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی کا تصور بھی نہیں لایا جا سکتا، لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک، انصاف کر، کہ تیرے حبیبؐ و محبوبؐ کو اِس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب تاب نہ لا سکا، تو تیرے اُس حبیب پاکؐ کے ایک ہیچمدان غلام کے غمِ مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان و نابینا تو ادنیٰ سی ادنیٰ آزمائش کا بھی تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اِس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لیے دل و جگر کس سے مانگ کر لائیں!

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں، کہ ایک بڑا قومی لیڈر اُٹھ گیا، نیشنل کانگریس کا سابق صدر چل بسا، ہند و مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہوگیا، یہ سب کچھ صحیح ہوگا لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا، کہ اللہ کا بندہ اُٹھ گیا، اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشقِ زار رخصت ہوگیا! آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک جادو بیان مقرر، اور بہترین انشا پرداز گم ہوگیا، ماتم اس کا ہے، کہ وہ گم ہوگیا، جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا، جس نے اپنی دنیا برباد کرکے، اپنی عاقبت بنائی تھی، جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا، جس نے زرّین لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اُتار کر، جیل کی کملی اوڑھ لی تھی، جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، اگر دھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لحظہ و ہر آن اگر تڑپ تھی، تو رسولؐ کی نصرت و خدمت کی! اُس کی سچی آپ بیتی خود اُسی کے ایک شعر میں سنیے ؎

سب کھو کے تری راہ میں میں دولتِ دُنیا سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے!

بیشک، اُس نے دنیا، اور دولتِ دُنیا، ساری کی ساری کھو کے رکھ دی، اور کھوئی بھی کسی کی راہ ہی میں! "کھوتے" ہوئے اور "لُٹتے" ہوئے سب نے دیکھا، "پاتے" ہوئے اور "لیتے"، ہوئے کی جھلک کسی کسی نے "آج" بھی دیکھ لی، اور "کل" انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت، ناموری، شروع ہی سے حصّہ میں آئی۔ علیگڈھ میں نام پیدا کیا، آکسفرڈ جا کر ناموری کہاں سے کہاں پہنچی "سول سروس" کی جانب لپکے، اُلٹے پانوؤں واپس کیے گئے، بڑودہ اور رامپور دونوں کی قدر شناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعائیں، جو غلاف کعبہ کو پکڑ کر رب کعبہ سے مانگی

گئی تھی، کہ "میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم بنا دے" ساتھ نہ چھوڑا، جو نہ صرف "مسٹر" تھا، بلکہ مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے "مولانا" تھا، چہرہ پر داڑھی، سر پر پٹے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن، اور دل کے اندر اسلام کا سوز، اور دین کی تڑپ! ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی، ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں، دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی، شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کامریڈ و ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قایل ہر ایک متنفس، لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظر بندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اُٹھائیں، اور آخر عمر میں اس سے بھی بڑھ کر آزمائش، کہ عمر بھر کے دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ! مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیۃ العلماء سے جنگ، "پنجابی ٹولی" سے جنگ، "بنگالی ٹولہ" سے جنگ، احناف سے جنگ، اہلِ حدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ، مدت سے تھی ہی، اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ! تصدق شروانی، خواجہ مجید، ڈاکٹر محمود، اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! غرض ایک خدا کے لیے، ساری خدائی سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا، لیکن جس کی نگاہ یہاں تک پہنچ چکی تھی، کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے!

اُسے کوئی کیا سمجھاتا، اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر، اللہ کے لیے، سب سے لڑا، اور خوب لڑا۔ شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا۔ کہا کرتا تھا، اور بالکل سچ کہا کرتا تھا، کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے، تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے، کہ یہ شخص دیوانہ ہوگیا ہے، خبطی ہوگیا ہے، کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے، نہ کسی کی دلشکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے۔ کوئی کہتا، کہ آخر ساری دُنیا کے اخبارات چل رہے ہیں، کامریڈ و ہمدرد کو بھی آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا؟ کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور وغل میں پڑکر محمد علی نے اپنی قوت و وقت کو ضایع کیا۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا، کہ جامعہ ملّیہ کی پرنسپلی پر جم جانا تھا، یا تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی! اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی "دیوانہ" ہو چکا تھا۔ اُسے جو کچھ دکھایا گیا تھا، اُس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہوجاتا، تو اُس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا؟

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　مرعس را دید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے، کہ محمد علی کو نیشنلسٹ ثابت کر دکھایا جائے، وہ "دیوانہ"، عقل و فرزانگی سے بیگانہ، دیوانگی کے اُس مرتبہ تک پہنچ چکا تھا، جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے، نہ "کمیونلزم" وہاں مدِ نظر صرف خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے، کہ جو اتنا اونچا ہو چکا، اُسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے، اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اُس کے لیے باعثِ فخر یہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کے بُت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی، بہت بڑا ہندوستانی تھا، اُسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا، لیکن اُس کی ہندوستانیت ماتحت تھی اُس کی اسلامیت کے! وہ "خدا" اور "وطن" دو کا قایل نہ تھا، قایل صرف "خدا" کا تھا، اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی فرض رکھی ہے، اس لیے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے کی گئی ہیں، اور جب وہ امیدیں

اُن پاکوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں، تو ناپاکوں نے اُن پر حملے بھی خوب خوب کیے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں، یہ سنت قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ قالوا یاصالح قد کنت فینا مرجواً قبل ھذا اتنھانا اَن نعبد ما یعبد اباؤنا وانّنا لفی شکٍّ مما تدعونا الیہ مریب۔ اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے، کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کا کیا، اُس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک اور خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشہ دیکھا گیا، کسی کو جلا وطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہو لہان کرایا گیا، اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔ محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ   دنیا ہی میں بیٹھے ہوے جنت کی فضا دیکھ

اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، محبّوں اور عاشقوں، سوختہ جانوں اور دلفگاروں کے لیے تو یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلّت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکستِ نفس!

عشقِ معشوقاں نہان ست و ستیر   عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشقِ معشوقاں دو رخ افروختہ   عشقِ عاشق جانِ او را سوختہ!

محمد علی، تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مُردہ کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے، اور پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام شاہد ہے والذین آمنوا باللہ و رسلہ اولئک ھم الصدیقون والشہداء عند ربھم لھم اجرھم و نورھم۔ تو اِس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا وہی روشن چہرہ لیے ہوئے، عالم برزخ میں جنت کی

سیر کر رہا ہے، اور تیرے نیاز مندوں کو اپنی جگہ پر یہ یقین ہے، کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کریگا۔ اپنی ناسوتی زندگی میں تونے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا۔ جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکیگا، اور جس طرح دنیا میں تونے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی انشاء اللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تونے اپنے ایک رفیقِ خاص، غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کامریڈ و ایڈیٹر نیو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے، وہی شعر آج خود تجھے سنانے کو جی چاہتا ہے،

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے!
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

بد نصیب قوم، تو رو، اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی و وارث چل بسا، تیرا سہاگ لٹ گیا، صبر کر، جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! خفتہ بخت ملت آج تو یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایہ پدری اٹھ گیا، شفقت پدری سے تو محروم ہوگئی۔ صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے رہتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے، وہ ہر نیست کو ہست، ہر ناممکن کو ممکن، کر دکھا سکتا ہے، لیکن ہم گرفتار اسباب بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں، اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں؟

تو نظیری ز فلک آمده بودی چو مسیح — باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ!

محمد علی کی عمر کُل ۵۲ سال کی ہوئی۔ حضورِ انورؐ نے اسی عمر میں مکّہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقا کی مکّی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آتا رہا، قبل اس کے کہ مخدوم کی مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے، خادم کا رشتۂ حیات ہی منقطع کر دیا گیا! آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ کل کس کس طرح نکل کر نہ رہینگی!

راجہ علی محمد خاں

محمد علی کے بعد علی محمد سنہ عیسوی کا آغاز تھا، کہ ملت نے محمد علی کا داغ سینہ پر کھایا، سنہ ہجری شروع ہوا، تو علی محمد خاں نے سفر آخرت اختیار فرمایا قوم کا خادم، جب رخصت ہوا تھا، اور وطن کا مخدوم اب

آج وہ، کل ہماری باری ہے!

آج "مہاراجہ" کی باری آئی، کل "مہاپرجا" کی باری تھی۔ شب برات میں ایک کی طلبی ہوئی، محرم میں دوسرے کی سنائونی سننی پڑی۔ غربا کا جگر "کل" پھٹ چکا تھا، امرا کا بازو "آج" ٹوٹ کر رہا! کن کن حسرتوں پر روئیے، اور دل کو کیا کہہ کر سمجھائیے! خاص و عام، امیر و غریب، راجہ اور پرجا، سب کے سب، اب حسرت و یاس کی تصویر، مجبوروں سے بڑھ کر مجبور، اور یتیموں سے بڑھ کر یتیم! انسان ضعیف البنیان، کائنات کے ذرہ ذرہ کی حرکت کو اپنی مرضی کے تابع دیکھنے کا آرزومند، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آج تک کبھی پروا کی گئی ہے! جس حکمت کاملہ نے، عالم کے سرور و سردار کو مخاطب کرکے انک میتٌ و انہم میتون کی منادی کردی، اس کی مشیت کے آگے، ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جو بھیجے گئے تھے، وہ واپس بلا لیے گئے، اور جس نے بھیجا تھا، وہ اسی آن اور اسی شان، اسی جاہ اور اسی جلال، اسی تزک اور اسی احتشام، اسی دارائی اور اسی کبریائی، اسی جمال

اور اُسی دلربائی، اُسی ناز اور اُسی محبوبی، اُسی حسن اور اُسی زیبائی کے ساتھ، جوں کا توں، قائم و موجود، حی و قیوم!

مِٹ گیا نقشِ احمد و محمود رہ گیا، لا الٰہ الا اللہ!

کہتے ہیں، کہ راجہ (پُرانے نیاز مندوں کی زبان بجائے لفظ 'مہاراجہ' کے "راجہ" ہی کی عادی ہے) علی محمد خاں شیعہ تھے، ہونگے، زبانوں پر چرچا ہے کہ بڑے نیشنلسٹ تھے، یہ بھی صحیح ہوگا۔ لیکن میں جن راجہ صاحب محمود آباد سے واقف تھا، وہ مسلمان ہی تھے، اور بڑے مسلمان۔ اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان۔ محمد علی کی سی تڑپ اور طپش نہ سہی، پھر بھی زبان پر محمدؐ کا کلمہ، دل میں اسلام کا درد، اور دماغ میں مسلمانوں کی خیر اندیشی۔ دسترخوان کی وسعت ہر مسلمان کے استقبال کو موجود، خزانہ کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لیے کھلی ہوئی، دولت کی تمنا تھی، تو مسلمانوں پر زرپاشی کے لیے اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے۔ ایک فیض کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لیے۔ ایک کرم کا دریا تھا افرادِ قوم کی آبیاری کو۔ ایک جود و عطا کا بادل تھا، جو اُمنڈ اُمنڈ کر برسا، اور اس طرح برسا کہ اپنے رقبۂ حدود میں تشنۂ لب نہ قوم کو چھوڑا، نہ افرادِ قوم کو! اُس کا درحاجتمندوں کا مرجع، اُس کی ڈیوڑھی ناداروں کی اُمیدگاہ۔ کم نصیب تھا وہ جو اُس کے ہاں سے مایوس، اور اُس کے پاس سے محروم واپس ہوا۔

صوبہ کا ایک شریف سُنّی مسلمان، حج کے لیے روانہ ہوتا ہے، اور رخصتی ملاقات کے وقت اپنے لڑکے کا ہاتھ اس "شیعہ" رئیس کے ہاتھ میں دے جاتا ہے۔ حاجی کو حج میسور و نصیب ہوتا ہے، اور استراحتِ دائمی کے لیے حرم پاک کی سرزمین۔ یتیم لڑکا کالج میں زیرِ تعلیم ہے، اور ختم تعلیم میں ایک سال کی

مدت باقی ہے۔ دریادل "شیعہ" رئیس کو اطلاع ہوتی ہے، اور بارہ مہینے کے بجائے سولہ مہینے کے لیے پچاس روپیہ ماہوار کے حساب سے پورے آٹھ سو کی رقم، بینک میں اُس کے نام سے جمع ہو جاتی ہے ——— لکھنؤ کے ایک نہایت شریف و ممتاز سُنّی گھرانے کی ایک مسکین بیوہ کی جوان لڑکی بیاہنے کو بیٹھی ہے، سامان غریبانہ حیثیت کا بھی میسّر نہیں، "شیعہ"، رئیس کو خبر ہوتی ہے، اور دوسری صبح کو ایک معتمد خاص کے ہاتھ ایک پورا سیکڑہ چُپ چُپاتے، اُسی بیوہ کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے ———

میں جس 'محمود آباد' کے غم میں افسردہ و ملول ہوں، وہ یہ تھا۔ اُس کی فیاضیوں کے بے شمار واقعات میں سے یہ دو صرف نمونہ کے طور پر یاد دلا دیے گئے۔ وہ قومی لیڈر، اور نیشنلسٹ پارٹی کا افسر، مسلم لیگ کا صدر، اور مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر، لکھنؤ یونیورسٹی کا ساعی اور اودھ چیف کورٹ کا بانی، ہٹلر کا دوست اور مسٹن کا دشمن، آئی، ڈی، ٹی کا مالک اور ہمدم کا پروپرائٹر، حکومت کا ہوم ممبر اور سرکار برطانیہ کا منظور نظر نہیں، وہ مسکین نواز و یتیم پرور، شریفوں کا سرپرست اور حاجتمندوں کا حاجت روا، بے وارثوں کا وارث، غریبوں کا دستگیر، مہمان نواز و سیر چشم، درماندوں کا شفیع اور بیواؤں کا کفیل علی محمد خاں تھا۔ اُس کے بڑے بڑے شاہانہ چندے اور لکھو کھا لاکھ کی قومی فیاضیاں سب نے دیکھیں، اُس کی چھپی ہوئی خیرات، اور پوشیدہ زرپاشیوں کی خبر، مخلوق میں سے کس کو؟

دُنیا اور اُس کی جگمگاہٹ ختم ہو چکی، نیشنلزم اور کمیونزم کے مناقشے تمام ہو چکے۔ بندہ اپنے مالک کے پاس پہنچ چکا۔ راجہ، پر جا بن کر، حقیقی مہاراجہ اور اصلی شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ نوحے لکھے جا رہے ہیں، رزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، تقریروں میں قوتِ خطابت کے کمالات دکھائے جا رہے ہیں، اور شعراء نادر مضمون آفرینیوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ مہذب دنیا کی ان طلسم آرائیوں کو چھوڑ کر، آئیے ہم اور آپ مل کر، سیکڑوں اور ہزاروں، محتاجوں اور درد مندوں، یتیموں اور

بیواؤں مسکینوں اور معذوروں کے ہم آہنگ ہوکر، مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت اُس ربّ الارباب کے حضور میں پیش کریں، جس نے اپنی رضا، ناتوانوں اور کمزوروں، بیکسوں اور دل شکستوں کی رضا میں مخفی کر رکھی ہے، آج نہ راجگی باقی ہے نہ مہاراجگی، نہ ٹیلر کی دوستی کام آرہی ہے، نہ حکومت کی ہوم ممبری، نہ کے، سی، اس، آئی کا خطاب پوچھا جارہا ہے، نہ انجمن تعلقداران اودھ کی صدارت۔ نہ کوئی مصاحب رفیق ہے، نہ کوئی مشیر۔ ہاں، آج قدر ہو رہی ہے، تو اُن بھوکوں کے کھانا کھلانے کی، جو دانہ دانہ کو ترس رہے تھے، اُن ننگوں کو کپڑے پہنانے کی، جو ایک ایک دھجی اور ایک ایک چیٹ کے لیے آسمان کا منہ تک رہے تھے۔ جو مخلوق کی نظر میں حقیر اور بیچارے تھے، وہ خالق کے دربار میں رفعت والے نکلے جنھیں کچہریوں کے پیادوں اور کوٹھیوں کے دربانوں نے دھکے دے دے کر نکالا تھا، انھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے ملائکہ کی صفیں آگے بڑھیں۔ جس نے دنیا میں ان ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا، ان ٹھکرائے ہوئے سروں پر اپنا ہاتھ پھیرا تھا، اُس کی بشری کمزوریوں اور لغزشوں کا شمار کچھ بھی سہی، کیا اُس مولا کے دربار میں، جو کریموں کا کریم ہے، اُس کے ساتھ بجز لطف و مرحمت، بجز عفو و مغفرت کے، کسی اور معاملہ کی بھی توقع ہوسکتی ہے؟ جا، اے نیکدل رئیس، اے امت مرحومہ کے غمخوار و غمگسار، اپنے رب اور اپنے مولا کے حضور میں خوش خوش جا، خائف و متردد نہ ہو، کہ آج تیری حمایت اور پشت پناہی پر، یتیموں کی فوج کی فوج، بیواؤں کی قطاروں کی قطاریں، اور بیکسوں اور بینواؤں کی صفیں کی صفیں ہیں!۔

ہمنام نامور
عبدالماجد بدایونی

سنہ عیسوی کا آغاز تھا، کہ قوم کو ناخدائے قوم، محمد علیؒ کا داغ سہنا پڑا تھا، سنہ عیسوی ختم ہو رہا ہے، کہ محمد علیؒ کے دوست و محب، عبدالماجد بدایونی نے، یک بیک اور دفعتہً اپنے پست اور ادنیٰ رفیقوں کو چھوڑ چھاڑ کر، اس بیوفا دنیا سے منہ موڑ کر، "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے! سنتے چلے آئے تھے، کہ آغاز اور انجام میں ایک رشتہ ہوتا ہے، اور "اوّل بآخر نسبتے دارد"، کسے خبر تھی۔ کہ جو سال شروع یوں ہوا تھا، وہ ختم بھی یوں ہوگا، اور کون کہہ سکتا تھا، کہ ملت کے حق میں، یہ پرانی ضرب المثل، اپنے اس دردناک معنی میں صادق آکر رہیگی!

شعبان سنہ ۴۹ھ آیا، تو ماتم اس کا کرنا پڑا، جو تحریک خلافت کا بانی و علم بردار تھا۔ شعبان سنہ ۵۰ھ آیا، تو زخم اُس کا اُٹھانا پڑا، جو اِس وقت خلافت کمیٹی کا صدر تھا! کہتے ہیں، کہ اسی ماہ مبارک میں ایک شب مبارک ایسی آتی ہے، جس میں سال بھر کے لیے، افراد و اقوام کی قسمتوں کے فیصلے صادر ہوتے ہیں، کیا ہم شور بختوں کی قسمت میں، اب لیلۃ البرات کے معنی، صرف نالہ و فریاد، یتیمی و بیوگی حسرت و حرماں، غم و الم، شیون و ماتم کے رہ گئے ہیں؟ —— نہیں، شعبان کو تو نبیؐ نے اپنا مہینہ کہہ کر پکارا ہے، شعبان شہری کے خلعت سے سرافراز کیا ہے، اسے سال کے سب مہینوں سے محبوب تر قرار دیا ہے (کان احب الشہور الی رسول اللہ صلعم شعبان۔ ابوداؤد) حق ہے، کہ اُس آقاؐ کے سر فروش غلام

اس جہینہ کو اپنے لیے اختیار کریں، اور اُس شمع کے پروانے، اپنی اپنی جان کے نذرانے، اسی محبوب زمانہ میں، لے لے کر آگے بڑھیں!

مرحوم، بدایوں کے مشہور و معزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے۔ ناز و نعمت میں پرورش پائے ہوئے۔ ابتدا سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک، دوسروں کو کھلا کر کھانے والے۔ تحریکِ خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیارِ زندگی بدل دیا، اور معاشرت بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کر لی۔ جیل نہیں گئے، لیکن جیل پہنچنے کی کوشش میں کوئی کسر بھی نہیں اُٹھا رکھی۔ اور ایک عمر کی عادتوں کو دفعتہً ترک کر کے، درویشانہ زندگی اختیار کر لینے کا مجاہدہ بھی، جیل خانے کے مجاہدہ سے کم نہ تھا۔ خلافت، جمعیۃ علماء، تبلیغ، تنظیم، مسلم کانفرنس، اور آخر میں پھر خلافت، جس تحریک میں شریک ہوئے، دل و جان، شغف و انہماک، مستعدی و سرگرمی سے شریک ہوئے۔ جس کام کو ہاتھ لگایا، اُس میں جان ڈال دی۔ زندگی کے آخری ۱۱ - ۱۲ سال کا ہر گھنٹہ، بلکہ کہنا چاہیے، ہر منٹ، قومیات کے لیے وقف تھا۔ سکون و راحت کا کوئی زمانہ نہ تھا۔ مسلسل علالتوں اور پیہم خانگی صدمات کے باوجود، کام کے پیچھے دیوانے تھے، اور ایک جگہ بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ تیز بخار چڑھا ہوا، اور حجاز کانفرنس کے اہتمام میں مصروف، سینہ میں درد ہو رہا ہے، اور امین آباد پارک میں محفل میلاد، ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے تک بیان کر رہے ہیں۔ شانہ میں ورم، ہاتھ جھولے میں پڑا ہوا، لیکن یہ کیسے ممکن، کہ مجلس تنظیم کی مجلس عاملہ میں شرکت نہ ہو؟ والدۂ ماجدہ نزع میں، اور مولانا کانپور میں تقریر کر رہے ہیں، بہو کی آخری سانسوں کی اطلاع آ رہی ہے، اور آپ ہیں، کہ دہلی کی جامع مسجد میں خود رو رو کر دوسروں کو بھی رُلا رہے ہیں! کل لکھنؤ میں تھے، آج کلکتہ پہنچ گئے۔ عید کا چاند لاہور میں دیکھا تھا، نماز آکر میرٹھ میں پڑھی۔ صبح پٹنہ میں تھے، شام کو معلوم ہوا، کہ دکن کے راستہ میں

ہیں! عجیب و غریب مستعدی تھی، عجیب تر ہمت و مردانگی!

تحریکِ خلافت کے، کم از کم اپنے صوبہ میں تو شاید سب سے بڑے پُرجوش مبلغ و علم بردار رہے۔ مدتوں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے جمعیۃ العلماء کے اجلاس اجمیر، واقع مارچ ۱۹۲۲ء میں، جو ہنگامہ خیز تقریر کی تھی، اُس کی گونج گویا اب تک کانوں میں سمائی ہوئی ہے۔ کانگرس نے بھی ایک زمانہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اُس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تو بہرحال تھے، غالباً اُس کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ اور تحریکِ تنظیم، ۱۹۲۴ء و ۱۹۲۵ء والی تو جب تک زندہ رہی، بڑی حد تک انھیں کے دَم سے جیتی رہی۔ مسیح الملک اجمل خاںؒ مرحوم، اور رئیس المّلت محمد علیؒ، دونوں سے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ شاید انھیں سے ملنے کی جلدی تھی، جو وہ مضطرب روح، سب کو مضطرب چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی۔

لکھتے اچھا تھے، متعدد رسائل و مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ لیکن جیسا لکھتے تھے، اُس سے کہیں بہتر، بدرجہا بہتر، چند در چند بہتر، بولتے تھے۔ تقریر، اور موثر تقریر، کرہر موضوع پر سکتے تھے، اور سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے، اور مجلس کو لُٹا دیتے تھے۔ لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفلِ میلاد تھی۔ حبیب رب العالمین کا ذِکر پاک کرتے کو اُٹھتے، تو آپ میں نہ رہتے۔ بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے، اور شاخِ گُل کی طرح جھومتے اور لچکتے۔ خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی، اور خوش بیانی مست ہو ہو کر منہ چومتی۔ ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا، کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا، اور ایک ایک جملہ، نظر آتا تھا، کہ سوز و گداز کے عطر میں بسا ہوا، نکلتا چلا آرہا ہے! فصاحت و بلاغت کا ایک دریا تھا، کہ اُبلا پڑتا ہے۔ کیا ابھی ربیع الاول میں جنت کی حوروں اور آسمان کے فرشتوں کو بھی اس کا شوق ہوا ہے، کہ جس کے مرتبہ سے وہ خوب واقف ہیں، اُس کی نعت ایک خاکی کی زبان سے بھی سنیں؟

بڑے زبردست وخوش عقیدہ صوفی تھے۔ قادریت تو حدِ توغل تک پہنچی ہوئی۔ ہر بزرگ کے ادب شناس، اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش، بزرگان دیوبند سے صاف نہ تھے، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے پوری طرح معتقد۔ بڑے ذہین، بڑے ذکی، شوخ وطبّاع۔ بڑوں کی عظمت کرنے والے، چھوٹوں پر شفقت رکھنے والے۔ متواضع وخوش اخلاق، فیاض ومہماں نواز۔ سو وصفوں کا ایک وصف یہ تھا، کہ جس سے ملتے کھل کر ملتے، دل سے ملتے، تکبر سے دُور، تمکنت سے نفور۔ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے اور اپنے اعزاز و وقار کی ذرا پروا نہ کرتے۔ جس کے دوست ہو گئے، آخر تک ساتھ دیا، حق نباہ دیا۔ وضعدار ایسے، کہ دوستوں اور دوستی کے اوپر سب کچھ قربان کر دیا۔ لڑتے تو معاف کرنے پر تیار ہو جاتے۔ روٹھتے، تو بخشنے میں دیر نہ کرتے! دوستوں سے خفا ذرا جلد ہوتے خوش جلد تر ہو جاتے۔ ہمدردی ہر مسلمان کے ساتھ کرتے، اور خدمت پر ہر چھوٹے بڑے کی کمربستہ رہتے۔ لکھنؤ میں ایک مُرید کے ہاں شادی کی تقریب تھی، خود دوڑ دوڑ کر مہمانوں تک کھانا پہنچاتے تھے، اور شیخ ہو کر مُریدوں سے بڑھ کر کام کرتے تھے۔

مرنے والے، اپنے مالک ومولا کے حضور میں جا اور اپنے ایک ادنیٰ وگمنام ہمنام کا آخری سلام لیتا جا۔ تو نے اپنے وطن سے دُور، مسافرت میں موت پائی، اور تیرے سچے سردارؐ نے اس موت کو شہادت کی موت فرمایا ہے۔ تیرے نامور آقاؐ نے اپنا سفرِ آخرت دوشنبہ کی صبح کو اختیار کیا تھا، تیرا رختِ سفر بھی اس سے کچھ ہی قبل، شب دوشنبہ میں بندھا۔ تیری خوش نصیبی میں کسے شبہ؟ لیکن یہ تو تھا، کہ تو دوسروں کے بچّوں پر رحیم وشفیق تھا، آج خود تیرے کمسن بچّوں اور بچیوں کے سر پر ہاتھ کون پھیریگا؟ تیرا دردمند دل بیوہ کی اعانت کے لیے تڑپ جاتا تھا، آج خود تیری لُٹی اور اُجڑی ہوئی بیوہ کی غمگساری کون کریگا؟ تو ہر مسلمان کے حق میں قوتِ بازو تھا، آج خود تیرے بھائی کے مجروح دل پر کون مرہم رکھیگا؟

توقوم کے دھندوں سے کسی وقت خالی نہ تھا، اب اس بیڑے کی ناخدائی کون کریگا؟ ——— ہاں، وہی کریگا، جو تیری طرح فانی نہیں، باقی ہے، عبد نہیں، رب ہے، بے بس نہیں، قادر ہے۔ جو ہر یتیم کے حق میں باپ سے کہیں بڑھ کر شفیق، ہر بیوہ کے لیے شوہر سے کہیں بڑھ کر غمگسار، ہر مسلمان کے لیے بھائی سے کہیں بڑھ کر سامان تقویت، اور قوم کے حق میں ہر سردار قوم سے کہیں بڑھ کر ناصر و حافظ ہے ....

....

جو اُن کا سہارا ہے، جن کا کوئی سہارا نہیں۔ اور جو جس خاک کے پُتلے سے، جب تک جو کام چاہتا ہے، لیتا رہتا ہے، اور جب چاہتا ہے، اپنے حضور میں واپس بلا لیتا ہے۔ بقا ہے، تو ایک اُسی کی ذات کو، اور دوام ہے، تو بس اُسی کے نام کو، اور اُسی کے کام کو!

انجیل اہل انجیل کی زبان سے

اصل انجیل، جسے مسلمان قرآن مجید ہی کی طرح کی کتاب نفظاً لفظاً اللہ کے ہاں سے اتری ہوئی مانتے ہیں، وہ کیا ہوئی، یہ ایک بالکل علیحدہ بحث ہے۔ یہاں انجیل سے مراد، انسانوں، عام انسانوں کا لکھا ہوا وہ مجموعۂ کتب ہے، جسے آج مسیحی اپنی "الہامی کتاب" کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں کے عوام ہی نہیں، اچھے اچھے علماء تک اس سے ناواقف ہیں کہ خود مسیحی اپنی اس "آسمانی کتاب" کے باب میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں، اور اُسے کیا کہکر، کس حیثیت سے، دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مسلمان اپنی سادہ دلی سے اس مروج انجیل کو بھی قرآن ہی پر قیاس کیے ہوئے اسے اُسی قسم کی ایک چیز (گو محرف صورت میں) تسلیم کیے ہوئے ہیں۔ اور اپنے نزدیک یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مانتے ہیں، اُسی طرح مسیحی بھی (گو کسی قدر مبالغہ کے ساتھ) حضرت مسیحؑ کو پیمبر مانے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں مفروضے تمام تر غلط ہیں۔ کوئی عیسائی نہ حضرت مسیحؑ کو پیمبر مانتا ہے نہ انجیل کو کتاب آسمانی۔ حضرت مسیحؑ کی پیمبری وا لوہیت پر گفتگو تو انشاء اللہ پھر کبھی آئے گی۔ آج صرف یہ دکھانا ہے کہ مسیحی عقیدہ اس نام نہاد "انجیل" یا مسیحی زبان میں "عہد نامۂ جدید" New Testament سے متعلق کیا ہے۔

مضمون ایک بڑے فاضل مسیحی اور مستند پادری ڈاکٹر بارنس E. Mr. Barnes ڈاکٹر آف سائنس، فیلو رائل سوسائٹی بشپ آف برمنگھم کے قلم سے ہے۔ اور جدید کتاب Outline of Literature کی جلد اول میں چھپا ہوا موجود ہے متن میں محض ترجمہ درج ہوگا۔ حاشیے البتہ مترجم کے قلم سے ہوں گے)

عہد نامہ جدید کی کتابوں کی زبان یونانی تھی۔ اور سب لکھنے والے حضرت لوقا کے ممکن استثنار کے ساتھ یہودی تھے۔ لیکن ان کی یونانی ہومر کے زمانے کی نہیں، بلکہ تھیوسی ویڈیس یا فلاطون زمانے کی بھی نہیں اوہ جدید یونانی تھی یعنی ہمارے سنہ کی پہلی صدی کی وہ عام زبان جس میں لوگ اپنے دوستوں سے گفتگو اور اپنی بیویوں سے مراسلت کرتے تھے۔ اس زمانے کی علمی

۱۔ ٹھیٹھ اسلامی اصطلاح میں انھیں سورتوں سے تعبیر کیا جا سکتا تھا موجودہ انکی تعداد ۲۷ ہے۔

۲۔ جو نسلاً حضرت مسیحؑ کی زبان نہ تھی۔ حضرتؑ اسرائیلی تھے اور اسرائیلیوں کی زبان پہلے تو عبرانی رہی تھی، بعد کو سریانی ہوگئی تھی۔

۳۔ محض ترتیب دینے والے نہیں "لکھنے والے" یا مصنفینِ انجیل! کوئی مسلمان غریب خواب میں بھی نعوذ باللہ "مصنفین قرآن" لکھنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

۴۔ یہ مسیح کے صحابی یا حواری تو یقیناً نہ تھے۔ صرف پولوس کے دوست رفیق کی حیثیت سے مشہور ہیں مصور و طبیب تھے۔ ایک انجیل ان کے نام سے منسوب ہے۔

۵۔ یونان کا بہت قدیم شاعر جس کا زمانہ کوئی سنہ ۸۵۰ ق م بتاتا ہے اور کوئی سنہ ۱۱۰۰ ق م

۶۔ مشہور یونانی مصنف سال وفات سنہ ۳۳۸ ق م

۷۔ مشہور فیلسوف۔ سال وفات سنہ ۳۴۷ ق م۔

۸۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو اصل انجیلیں موجود ہیں (ترجمہ نہیں) وہ خدائی الفاظ میں

یونانی آور دوسے بھری ہوئی تھی، جس کا مقصد قدیم ادبی طرز انشار کی نقالی تھی۔ عہد نامۂ جدید کی زبان اُس سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتی رہی۔ یہاںتک کہ ابھی حال ہی میں اُس عہد کے خانگی اور تجارتی مراسلات کا پتہ ریگستان مصر سے چلا، اور جب اُس کی صحیح نوعیت منکشف ہوئی۔[۱]

عہد نامۂ جدید کے مصنفین نے بجا طور پر اس عوامی زبان کا استعمال کیا۔ اس لیے کہ اُن کے پیش نظر مسیحیت کا پھیلانا تھا، نہ صرف ایک تعلیم یافتہ اقلیت کے درمیان بلکہ وسیع سے وسیع حلقے میں[۲] مسیحیت کے قبول کرنے والے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ تو غیر کیا ہوتیں، حضرت مسیح کی زبان میں بھی نہیں! صرف اُس زبان (یعنی یونانی) میں ہیں، جو حضرت مسیح کے وقت سے ایک صدی کے اندر فلسطین میں رائج ہو گئی تھی!

[۱] انجیلوں کی زبان اُس زمانے کی دوسری یونانی تصانیف سے خاصی مختلف ہے۔ اور یہ اختلاف علمار انجیل کو اب تک سخت حیران کیے ہوئے تھا۔ مضمون نگار اس الجھاؤ سے مخلصی یہ کہکر دلا رہا ہے کہ اس وقت کی جو خانگی تحریریں حال میں برآمد ہوئی ہیں، ان کی طرز انشاء بالکل اناجیل سے مطابق نکلی۔ گویا انجیل نگاروں نے اپنے زمانے کے علمی و ادبی معیار کا نہیں، بلکہ خانگی اور گھریلو تحریروں کا اتباع کیا ہے۔

[۲] گویا اس سے کوئی بحث ہی نہیں، کہ اصل وحی یا الہام کا نزول ہوا کس زبان میں تھا۔ یہاںتک کہ یہ سوال بھی قابل التفات نہیں کہ حضرت مسیح نے اس پیام کو ادا کس زبان میں کیا تھا! بلکہ اصل مسئلہ کوئی بہت ہی مہتم بالشان، صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ تبلیغ کے اغراض کے لیے، عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد تک پہنچنے کے لیے، کون موزوں ترین زبان مسیح کے حواریوں، شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کو مل سکتی تھی!! ۔ گویا مسلمان اس سوال کو نظر انداز کر دیں کہ قرآن کا نزول کس زبان میں ہوا تھا، اس کو بھی بھول جائیں کہ جس پر نازل ہوا تھا، اس کی زبان کیا تھی؟ اور بحث صرف اس سے رکھیں کہ صحابیوں

اب زیادہ تر وہی لوگ تھے جنھیں آج کی زبان میں ادنیٰ طبقہ متوسط (لوور مڈل کلاس) کہا جائے گا۔ مسیح کے خصوصی شاگردوں میں بھی زیادہ تر لوگ اسی طبقے کے تھے بعض مثلاً فرزندان زبدی غالباً خوشحال بھی تھے لیکن بہرحال غلاموں کے طبقے سے تو سب ہی اوپر تھے۔ ابتدائی مبلغ، ہر طبقے کے مردوں عورتوں کو خوش آمدید کہتے تھے۔ ان لوگوں نے گو استعمال بول چال والی یونانی کا کیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ لوگ غیر تعلیم یافتہ تھے۔ حضرت پولوس[1] جو پوری مذہبی تربیت پائے ہوئے تھے غالباً ایسے والدکے فرزند تھے جو اپنے شہر میں خاصی حیثیت رکھنے والے تھے[2]۔ حضرت لوقا[3] اور حضرت یوحنا[4] مبلغ دونوں قابل و تعلیم یافتہ شخص تھے اور عہد نامۂ جدید کے دوسرے مصنفین بھی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ گو ان میں سے غالباً کسی کی بھی وہ مادری زبان نہ تھی۔

عہد نامۂ جدید کے مصنفین نے اگرچہ زبان ایسی اختیار کی جو علمی نہ تھی، تاہم جیسا کہ ہمارے (انگریزی کے) مستند ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اکثر اونچے معیارِ فصاحت تک پہنچ جاتے تھے اس اذعان کے ساتھ کہ وہ ایک عظیم الشان

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ بلکہ تابعین کو ملک در ملک مبلغ کے لیے سہولت کس زبان میں تھی؛ فارسی میں، پہلوی میں۔ وقس علیٰ ہذا، اور وہی زبان (نعوذ باللہ) اب قرآن کی زبان ہو!!

[1] سینٹ پال۔ تاریخ مسیحیت کی سب سے زیادہ مشہور و اہم شخصیت۔ کہنا چاہیے کہ موجودہ تثلیثی مسیحیت کے بانی۔ مسیح کے صحابی یا حواری یقیناً نہ تھے۔

[2] دوسرے انجیل نگاروں کی طرح انکے حالات و سوانح بھی تاریخ کی نظر سے مخفی ہیں۔

[3] سینٹ جان لیوک۔ ملاحظہ ہو حاشیہ [2]

[4] سینٹ جان حضرت مسیح کے بارہ حواریوں میں ایک نام ان کا بھی آتا ہے۔ چار "مستند" اناجیل میں سے آخری انجیل انھیں کے نام سے منسوب ہے

پیام پہنچا رہے ہیں، ان کی تحریروں میں آمد اور بے تکلفی ہے حضرت مرقس کی یونانی نا شستہ ہے تاہم بڑے اختصار کے ساتھ انھوں نے تذکرے کی ضرورت کو بڑے پر قوت اور بڑے پر اثر انداز سے پورا کر دیا ہے۔ حضرت پولوس اپنے خطوط ایک کاتب کو بول کر لکھاتے تھے۔ ان خطوط میں نا تمام فقرے بھی ملتے ہیں، اور پیچیدہ دلائل بھی، اور نیز انتقال خیالات بھی۔ ان کے پڑھتے وقت پولوس مبلغ کی تصویر ہمارے ذہن کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے مطالعہ کے وقت ہم دنگ رہ جاتے ہیں ان کے دماغ کی نکتہ آفرینی پر، ان کی دقت نظر پر اور ان کی قوت تخلیقی پر۔ اور کہیں کہیں تو وہ فصاحت بیان کے اس معیار پر پہنچ جاتے ہیں کہ اس کی نظیر لٹریچر میں کہیں نہیں ملتی۔ حال کے ایک فاضل نے حضرت یوحنا کی تحریر کے متعلق لکھا ہے کہ

"صرف و نحو تو خیر اس کی صحیح ہے، لیکن اس کی سادگی بیان خشکی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، اور محاورہ کی تو اس میں چاشنی ہی نہیں۔"

با ایں ہمہ اگرچہ ان کو اس زبان کے لکھنے میں بڑا زور لگانا پڑا ہے، جو ان کی اپنی نہیں، تاہم ان کی چوتھی انجیل اور ان کا مکتوب اول ادبیات کے دو شاہکار ہیں۔ وہی الفاظ دہرا دہرا کر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بے ربط جملے ایک دوسرے کے بعد ملتے ہیں۔ کسی طرح کی ان میں صنعت گری نہیں ہے۔ ہر چیز "پوست و استخوان" نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں توقع تو ناکامی محض کی ہوتی ہے، لیکن واقعہ بہترین جمال روحانی ہاتھ آتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صوفی اور فلسفی بچہ کی زبان میں گفتگو کر رہا ہے اور کسی دوسرے نے انسان کی قسم روحانی کو اتنا مالا مال نہیں کیا ہے۔ عہد نامہ جدید کے مصنفین میں سب سے زیادہ خوش قلم حضرت لوقا ہیں۔ ان کی انشار کی شستگی و روانی ان کی وسیع الخیالی ان کی نزاکت احساس، سب آج کے مذاق کے مطابق ہیں۔ اس کی قوت بیانہ غضب کی ہے، اور اس کا ثبوت ان کے قلم

سے نکلے ہوئے حضرت پولوس کے واقعۂ تباہی جہاز سے ملتا ہے۔ اور اگر کسی صاحب کو اُن کے بلکہ ادبی ہیں شبہہ ہے، تو وہ بطورِ خود مُسرف بیٹے کی حکایت کے لکھنے کی کوشش کر کے دیکھ لیں۔ یہ حکایت خود یسوع سے، تغیرِ خفیف کے ساتھ نقل ہوئی ہے" اور یسوع کی تعلیم کے ادبی پہلوؤں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں

عہد نامۂ جدید پہ ادبی تبصرہ میں بھی یہ ممکن نہیں کہ یسوعؑ ناصری کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کی شخصیت سارے صحیفوں کے مجموعے پر حکمران ہے، اور وہی اُس میں اندرونی وحدت پیدا کیے ہوئے ہے۔ یسوعؑ کی تعلیم خدا اور انسان کے باب میں، اس کی موت، اس کی سیرت کی کاملیت، نوعِ انسانی کے حق میں اس کی اہمیت۔ بس اسی قسم کے مسائل تو مصنفین عہد نامۂ جدید[1] کے موضوعِ تحریر ہیں۔ اور پھر جب ہم یہ خیال کر لیتے ہیں کہ یہ مصنفین بیشتر ایسے تھے، جنھیں یسوع سے کوئی ذاتی واقفیت تھی ہی نہیں[2]۔ نیز یہ کہ ان کی شہادت عینی نہیں، بلکہ بالواسطہ ہے، تو البتہ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسیح نے کتنا مضبوط اور گہرا اثر اُن لوگوں پر ڈالا ہو گا جو اس کی مختصر سی تبلیغی زندگی میں اس کے ساتھ رہے تھے[3]۔ مسیح کی زندگی کی جو تصویر ہمارے پاس ہے، اُس کے اہم عنصروں میں تو کوئی پوشیدگی ہے نہیں، ہم کو مسیح کے خیالات معلوم ہیں،

---

[1] ۔ ایک بار پھر ذہن نشین کر لیجیے کہ مسیحی حضرات جب اپنی "آسمانی" کتاب کا ذکر کرتے ہیں، ایسے ہی "مصنفین" لاتے ہیں۔ قرآن مجید کی طرح اُس کے ایک کتاب کے ہونے، اور آسمان سے لفظاً لفظاً نازل ہونے کا تو ان بیچاروں کو خواب و خیال میں بھی دعویٰ نہیں۔

[2] ۔ یعنی یہ انجیل نویس صحابی بھی نہ تھے۔

[3] ۔ تاریخی استناد کے کمزور نہیں، سرے سے مفقود ہونے کی یہ توجیہ کتنی معقول ہے، کہ راویوں کے لیے رویتِ عینی وغیرہ کی ضرورت ہی کیا تھی، حضرت مسیحؑ کی زبردست قوتِ باطنی کافی تھی جو صحابیوں اور پھر اُن صحابیوں کے صحابیوں کو درجہ بدرجہ متاثر کرتی رہی!

مزاج معلوم ہے، سیرت معلوم ہے[1]۔ ایسی کہ تاریخ میں اس کی مثال بہت بہت ہی کم اشخاص سے متعلق ملے گی۔

انجیلوں میں اس کی تعلیمات جو مندرج ہیں، وہ شاید ہماری توقع سے کچھ زیادہ ہی مفصل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم ترین انجیل بھی جب لکھی گئی ہے تو اس وقت مسیح کی وفات کو کم از کم تیس سال ہو چکے تھے[2]۔ لیکن یہود کا حافظہ غضب کا تھا، بہ خلاف ہم لوگوں کے، کہ ہمارا سہارا تحریری یادداشتیں ہیں۔ اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ نصف صدی گزر جانے پر بھی تعلیماتِ مسیح کے اجزا صحیح طور پر محفوظ رہ گئے ہوں[3]۔ یسوع کی پیدائش اغلباً سنہ ۴ ق م کی ہے۔ اور مصلوب وہ سنہ ۲۹ء میں ہوئے۔ اُن کی بول چال زبان فلسطین کی آرامی زبان تھی۔ لیکن وہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے، اور غالباً یونانی (رومی) زبان بول سکتے تھے۔ اُن کی پیدائش سے ایک صدی قبل ہی گلیل[4] کی آبادی کا بڑا حصہ غیر یہودی ہو چکا تھا۔ وہ غیر قوموں کی گلیل[5] تھی اور مسیح کی زندگی ہی میں کفر نحوم[6] اور آس پاس کے شہر جس قدر یہودی تھے اسی قدر یونانی و شامی بھی تھے۔ ناصرہ[7] کے قریب ہی جس کی آبادی عجب نہیں کہ ۱۰ ہزار کی ہو

---

[1] اور ان سارے معلومات کا ذریعہ؟ انہیں راویوں کا بیان جو سندِ متصل سے یکسر عاری و محروم ہیں!

[2] اور وہ انجیل بھی آج ناپید ہے۔

[3] "محفوظ رہے ہیں" نہیں۔ بلکہ "قرین قیاس ہے کہ محفوظ رہ گئے ہوں ـــــ" اس برتے پر اس کتاب کو قرآن کے سامنے لایا جا رہا ہے!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

[4] galileo ملک شام کا وہ ضلع جو حضرت مسیح کے خاندان کا مسکن تھا۔

[5] حوالہ انجیل کا ہے۔

[6] Capernaur حضرت کے وطن قصبۂ ناصرہ سے متصل ایک موضع۔

[7] ضلع گلیل کا قصبہ، حضرت کا آبائی وطن۔

بڑی بڑی شاہراہیں گزرتی تھیں جو علاقہ لیوانٹ[1] کے بڑے بڑے شہروں کو ملائے ہوئے تھیں۔ غرض یہ کہ یسوع کا ظہور اگرچہ ایک نجار کے جھونپڑے سے ہوا تھا[2] تاہم وہ اپنی نوعمری میں وسیع دنیا سے بیگانہ نہیں رہے تھے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود وہی تھے، جیسا کہ پروفیسر بیک نے کہا ہے،

"تاریخ میں کوئی ایسی ہستی نہیں ملتی جو اعتدال اور توازنِ دماغ میں ان سے کامل تر، اور اخلاص میں ان سے برتر، اخلاقی احکام میں ان سے زیادہ دقیق النظر، اور باطل کی تردید میں ان سے زیادہ بے لاگ ہو۔"

ان کی تعلیم کا واضح ترین نمونہ ان کی بیان کی ہوئی تمثیلوں میں اور اس مجموعۂ ارشادات میں نظر آتا ہے، جسے ہم پہاڑی کا وعظ کہتے ہیں[3]۔ یہ اقوال اپنے متکلم کی خالص مذہبی ساخت کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ان کے اندر بلند ترین اخلاقی تخیلات چھوٹے چھوٹے فقروں اور چٹکلوں کے اندر بند ہیں۔ احکام جو ہیں وہ بالکل صاف سیدھے، غیر مبہم و مخلصانہ ہیں۔ گویا بیان کی سادگی اور عقیدے کی پختگی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے ہیں۔ متکلم کے نزدیک جس طرح زمین کا وجود یقینی ہے، آسمان کا بھی ہے۔ آستے انسانوں سے زیادہ خدا کی حیثیت نصیب ہے۔ اسے قلبِ انسانی سے متعلق گہری بصیرت حاصل ہے۔ اور ایسا ہی عمیق ادراک خدا کی ذات و صفات سے متعلق۔ اس کا نہ قدم کہیں لڑکھڑاتا ہے، نہ وہ کبھی ابہام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس کا دماغ حیرت انگیز حد تک زرخیز ہے جو ظاہری تضاد کے درمیان وحدت پیدا کر دینے والا۔ اور اگر استعارہ کی زبان کے استعمال کی اجازت ہو تو

---

[1] Iouant روم کا ساحلی علاقہ شام، انطاکیہ کی جانب۔

[2] حضرت مریمؑ کے منگیتر (حسبِ روایتِ انجیل) شوہر۔ حضرت یوسف نجاری کا پیشہ کرتے تھے۔

[3] Serman on the Mount یہ وعظ انجیل متی باب ۵ سے باب ۷ تک آیا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس کی طباعی ایک مذہبی داخلاقی صنّاع کی طباعی ہے۔ اس کے اندر وہ خشک متانت ہے جو حکمتِ اعلیٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا پُرسکون اقتدار ہیبت آفریں اور عظمت آفریں ہے باقی ہم تو یہی کہتے ہیں کہ اُسے جو احترام اور جو محبوبیت حاصل ہے وہ انسانی تاریخ میں اور کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

اور یہیں سے ہے کہ اناجیل اربعہ جس بڑی تعداد میں طبع ہوئی ہیں اور جس بڑی تعداد میں اور جس غور و توجہ اور جس عقیدت سے پڑھی گئی ہیں وہ بات کسی کتاب کو بھی حاصل نہیں ہوئی ہے

ان میں سب سے قدیم انجیل حسبِ روایت حضرت مرقس ہے یہ غالباً سنہ ۷۰ء سقوط بیت المقدس کے وقت معرضِ تحریر میں آئی[۱]۔ یہ بھی ممکن کہ اس کے دس سال بعد۔ اس کا ماخذ وہ عام تبلیغ ہے جو حضرت پطرس اور قدیم ترین مبلغین کیا کرتے تھے[۲]۔ اس کے مصنف جان مارک (یوحنا مرقس) ہیں برناباس کے بھتیجے اور وقتاً فوقتاً حضرت پولوس کے رفیق۔ جب یسوع کے جاننے والے دنیا سے اُٹھنے لگے تو حضرت مرقس دائرۂ تحریر میں لے آئے۔ دیانت اور خوش تاثیری کے ساتھ اس سرگزشت کو جو انکے لیے مایۂ بشارت تھی، اُن کی انجیل وہی تھی۔ انھوں نے اس کتاب میں یوحنا بپتسمہ دینے والے[۳] کے آخر زمانے کے حالات کو بھی شامل کر لیا، جو انھیں غالباً نبی موصوف کے کسی پیرو سے مل گئے تھے۔ اور باب ۱۳ میں وہ چھوٹا سا مکاشفہ بھی شامل کر دیا، جس کے اندر کسی مسیحی یہودی نے اپنے نظریۂ قیامت کے ساتھ مسیح کی پیشگوئی بربادی بیت المقدس کو مخلوط کر دیا ہے۔

انجیل حسب روایت حضرت لوقا، اور رسولوں کے اعمال ایک ہی شخص کی تصنیف ہیں، جس نے اعمال کے نصف آخر میں ایک مسافر کے روزنامچہ کے اجزا بھی شامل

۱۔ العظمۃ للّٰہ! قدیم ترین موجودہ انجیل بھی سنہ ۷۰ء میں تالیف ہوئی اور وہ بھی "غالباً"!

۲۔ یعنی براہِ راست حضرت مسیح کے ارشادات اس میں بھی نہیں بلکہ اس کا ماخذ بھی بعض حواریوں کے بیانات!

۳۔ John the Baptist یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام۔

کر دیے ہیں، جس نے حضرت پولوس کے ساتھ سفر کیا تھا، جب وہ روم میں قید ہوگئے تھے[1]۔ اغلب یہی ہے کہ یہ روزنامچہ نویس حضرت لوقا ہوں اور اس اپنی نام والی انجیل اور اعمال دونوں کے مصنف ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اعمال میں حضرت پولوس کی شہادت کا ذکر اسلیے نہ ہو کہ وہ تصنیف ہی واقعہ سے قبل ہو چکی تھی اور اس صورت میں اس انجیل کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۶۰ء کے قریب ماننا پڑے گا لیکن بہت سے فاضلوں کا خیال ہے کہ یہ اسی وقت سے ایک نسل بعد کی تصنیف ہے اور بعض کا قول ہے کہ نہیں بلکہ کسی مجہول الحال مرتب نے حضرت لوقا کے روزنامچہ سے کام کیا ہے بہرکیف اتنا تو اب بہ دلائل ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت لوقا اور انجیل حسب روایت حضرت متی کے مصنف دونوں نے انجیل مرقس سے کام لیا ہے، نیز ایک اور قدیم نوشتہ ہے جو اب گم ہو گیا ہے اس نوشتہ کا نام ماہرین فن نے اپنی اصطلاح میں ق (Q) رکھ لیا ہے۔ یہ مسیح کی تعلیمات کا نہایت درجہ اہم بیان تھا، جسے متی حواری نے لکھا تھا۔ اس کا بڑا حصہ ہماری پہلی انجیل میں پہاڑی وعظ کے زیر عنوان آگیا ہے اور اسی مناسبت سے پہلی انجیل حضرت متی سے منسوب ہو گئی ہے ورنہ درحقیقت وہ لکھی ہوئی تو فلسطین کے کسی مجہول الحال مسیحی یہودی کی ہے اور زمانہ تصنیف تقریباً ۸۵ء ہے۔ اس لکھنے والے نے علاوہ مرقس اور ق کے پرانے حوالوں سے بھی کام لیا ہے جن سے یہ ثابت ہو کہ مسیح وہی ہیں جن کی بابت پیشگوئی زمانہ قدیم سے یہود میں چلی آرہی ہے۔ عہد نامۂ قدیم سے اس طرح کا کام لینا اس وقت کے احبار یہود کے طریق تفسیر مجازی کے عین مطابق تھا، گو اب ہم اسے قابل اطمینان نہیں سمجھتے۔ اسی انجیل متی میں ہم کو کلیسا کے وہ رسوم بھی نظر آجاتے ہیں، جو وفات مسیح سے نصف صدی کے اندر پیدا ہو گئے تھے، اور جن کی بابت یہ اعتقاد تھا کہ وہ اس کی منظوری حاصل کیے ہوئے ہیں یہ کتاب عام عبادت گاہوں میں سنانے کے

---

[1] گویا اناجیل اربعہ میں سے کسی کے بھی مصنف کا تحقیق کیا تھا پتہ نہیں؟ سب خود محض ظن، تخمین، قیاس و استنباط ہے۔

لیے بہت موزوں ہے، اور اسے انجیلوں میں پہلے نمبر پر اس لیے رکھا گیا کہ ایک زمانے میں یہی سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی تھی۔ موجودہ دنیا مرقس کی عزت زیادہ کرتی ہے، اس لیے کہ یہ قدیم تر ہے، تاہم کہیں زمانہ ایسا بھی گزر چکا ہے جب مرقس بھی نسخۂ رق کی طرح گم ہو جانے کو تھی۔ اور آخر حصہ تو اس کا ضائع ہی ہو چکا ہے۔ بہ قول پروفیسر برکٹ کے تمام موجودہ مسودات نقل ہیں صرف ایک نسخۂ فرسودہ کے[1]۔

---

[1] وہ سب نقل ایک ہی "فرسودہ نسخہ" کے سہی لیکن خود اس اکیلے فرسودہ نسخہ ہی کی صحت اور اصلیت کب ثابت ہے۔

جوہر اور ان کی شاعری

(۱)

آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف وابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاران کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس لئے روز اُن کی زیارت یوں ہی ہو جاتی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا۔ (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مشکی خر — آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجیے۔

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا — خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا۔ مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا "کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں"۔ میری عمر بہت کم تھی بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے انھیں کے چند شعر انھیں سنا دیے سُن کر پھڑک گئے اور اُس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعوی کروں کہ شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعوی تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنیئے، میں نہ صرف شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار رہا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر وسخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو وفضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری (OFFicial biography) (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے "میری امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے، یا سیرۂ پیشوائے قوم وملک میں جگہ دی جائے ہمدرد کے صنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہوگیا)

تو ہمدردوں میں سے ایک بار چڑیا چڑونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چڑونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور روٹی کا معاملہ ہے۔ نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو۔ اور جواب دہی ہمارے سر آپڑے، آپ نفسیات کے ماہر ہیں کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرت نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنیوالی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کے نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالامال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیئے کہ گیارہ برس کی عمر میں علیگڈھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عرفی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے، مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعۂ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ، اسی وقت تیار ہو گئی میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکّہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا

تھا۔ ہیں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری بحر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (مرحوم الیہ جاج ویو تین جبک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکرٹری مسلم لیگ کے برادر اصغر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی، ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کیسا تھا

علیگڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی۔ مگر وہی فرضی معشوق اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک با معنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہد ان اصلی کی کمی نہ تھی مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس

کسی اور کے خیال تے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا۔ اور محض حالات گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی، بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو۔ اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں Touchstone کی A poor thing but mine own معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں۔

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں

...... (غزلیں درج) ہیں، یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں۔"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا اُن کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے تاریخ اس پر ۲۱ اگست ۱۹۲۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں ۱۹۱۶ء کے

شروع میں اُسی نظربندی کی حالت میں، ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی پہلے انگریزی میں اور پھر اُردو میں۔ کسی والا نامے میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیے تھے۔ اس پر اس نیازمند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب جا کر کھلے، ذرا کچھ فرمائیے تو آپ نے یہ شعرگوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا۔ آپ اُوپر پڑھ چکے۔ بالکل قلم برداشتہ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کر کے، ٹھہر ٹھہر کے، اور غور کر کر کے لکھے جاتے ہیں؟ .... بچارے کو خیال تک نہ ہوگا کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی!

(۳)

محمد علیؒ کو دنیا نے اول اول جانا تو اس حیثیت سے، کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں بولتے خوب ہیں۔ علیگڈھ کے فدائی ہیں" قوم" کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں پُرجوش ہیں، ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس' لورتن' کے نام سے قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے یا (کانگریسی اُردو میں) "چنے گئے"۔ لوٹ کر آئے بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی۔ شکسپیر کے فلاں ڈرامے پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز مضمون کیا۔ زبردست لکھ ڈالا۔ ۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دہلی لائے یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علی اڈیٹر نہ تھے، ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر، صحیح معنی میں لیڈر تھے، اب قوم اُن کی نہ تھی، وہ قوم کے تھے! جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی، بے خودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر

ضرب، ترکوں کے جسم پر نہیں، محمد علی کے قلب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لئے پکارا تو روپے کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونیں پیش آگیا، محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے...... اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے، ہاں مستِ الست!

ولایت گئے اور آئے۔ گرجے چیخے، چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہو گئی...... خلافت اسلامیہ کی جنگ! آہ، کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفہ اسلام کا پرچم لہرایا۔ ...... محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں۔ اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زباں بندی، معطلی کی نذر، شاعری کے جوہر اسی زمانے میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بن کر، نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں۔ ؎

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہیں　　　اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اُس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں، مہر ہی مہر، لیکن حقیقتِ مہر کبھی کبھی صورتِ قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ، سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا۔

عشقِ معشوقاں نہان ست و ستیر　　　عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر!

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے سوچ سمجھ کر بولے ؎

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر　　　دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزلِ مقصود پیشِ نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لئے نقدِ جاں کا مطالبہ ہونا تھا۔ ؎

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا　　　کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے۔ حصہ بقدر جثہ۔
یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر ‏ ‏ ‏ ‏ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرع لگایا ہے، یہ خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کر دیا ہے! اسی نظربندی کے زمانے میں ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں، اور گلی گلی، گھر گھر تبلیغ اسلام کروں!

نظربندی اور اس کے بعد جیل! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا تھا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پینترے! ادھر ہندوستان کے اندر، حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع سنہ ۱۹۲۰ء تھا۔ کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لئے دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے۔ اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں۔ وقت کی ضرورت ناگزیر، کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہا لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا چپکے چپکے اور اندر ہی اندر، دین کی تبلیغ بھی۔

اذاں حرم میں کلیسا میں، دیر میں ناقوس ‏ ‏ ‏ ‏ کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا، "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہرحال جرم ہی بنا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علیگڑھ میں ڈال چکے تھے اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ سنہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے۔ اور سنہ ۲۳ء تک کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ، سرکار دولتمدار کے مہمان! اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین رفعت میں آسمان سے مل جل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روداد تو کان لگا کر سُن ہی لیجئے ؎

معراج کی سی حال سجدہ میں ہے کیفیت ‏ ‏ ‏ ‏ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں!

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن، مذہب سے عزیز تر، دنیا، دین پر مقدم۔ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر! ...... وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر۔

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل وجان سے بڑھ کر محبوب، جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لئے یہ خبر سن کر کیسا کچھ پھڑپھڑایا ہوگا دل پر کیا کچھ بیت کر رہی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے۔ ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا — جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ — اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر، اور گڑگڑا، گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں۔

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے، قرآں میں کیا — تخرج الحی من المیت مذکور نہیں؟
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے اس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اسے قبر میں بھی اتارا!

سنہ ۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصبِ خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھیے کہ محمد علی پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، خیر محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہی۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط سنہ ۲۴ء سے آغاز سنہ ۳۱ء تک زندہ ضرور رہے اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے اور بچھڑے۔

سنہ ۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی اور سال ہی بھر بعد سنہ ۲۹ء میں اُسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ نکالا۔ ہمدرد نکالا۔ مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے یہ سب کچھ ہوا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا۔ لیکن دل کی کلی جو الفائے خلافت سے مرجھا چکی تھی، پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہئے۔ کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے بس وہ پورے کر رہے تھے!........اب وہ انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر دیکھتے ہیں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لئے تھا، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یہ ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر" مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان سنہ ۱۳۵۰ھ کی پندرہویں شب میں عین اُس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی!........شاید

اس لئے کہ اُس کے ہم قوم اور ہم وطن اُس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے! آزادیٔ محمد علی کے ملک کو کیا ملتی، محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں قبلہ اول ہیکل سلیمانؑ کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبال نے کہا، ذرا دیکھنا محمد رسول اللہ کا غلام اور شیدائی، محمد علی، جا کس راستے سے رہا ہے۔ ۶

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر، اس مدفن پر، رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور و شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اُس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارت گاہِ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک ہی کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی نہ دیباچے کی، نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹیے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب، جب جو حصہ چاہے کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں، تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علیؒ ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے، اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو۔ ؎

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلادیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہمنفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش — تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا — دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں، انگریزی ۱۹۰۶ء ہے۔ علیگڈھ، محمد علی کے محبوب علیگڈھ میں لڑکوں نے انگریز استاد کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے، کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشان! بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں اتفاق سے وہی دن سر سید کی برسی کا ہے "اولڈ بوائز" جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں، محمد علی اپنے نیچری پیر سے ڈرتے لرزتے نہیں، ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں، اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی شوخی اور مستی بھی ہے، اور درد و گداز بھی۔ ؎

جو لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیرِ دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمھیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڈھ میں
اور اس پر یہ تماشا، ہر طرف اور جابجا تم ہو

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تمہیں ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں   نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو، انگریزی کے زبردست انشا پرداز، کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان و تندرست۔ سر شام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین   کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے   ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رند بادۂ حق کے   ابھی دو چار خم پیئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی   کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ   ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام، کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح نہ ترمیم بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے۔ یہی حال نثر کا ہے، یہی حال نظم کا۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں، نظر بندی کا تھا لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت نظر کشائی کا قرار پایا! خوب خوب تپتے تپنے کی کہنے لگے

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو   ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اُسے   اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنیے!

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے
یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو

سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتداء ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو
باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

"حنا" کا قافیہ اس "طرح" میں آسانی سے آسکتا تھا، لیکن ذرا دیکھئے، محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا اک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہرحال ایک مسلّم استاد تھے جوہر ان کے مقابلے میں مبتدی اور نوآموز محض پھر بھی شعر کچھ ایسا ہیٹا نہیں رہا۔ ؎

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اُردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے۔ ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ کہنا تو محمد علی کی 'بی اماں' کا تھا، اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے۔ ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے، یا اپنی آٹو بیاگرافی (خود نوشت سوانحِ عمری) "آپ بیتی" قلمبند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے
کیوں ایسے نبی پہ نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لئے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے۔ ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحبِ معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعے کو رکھا۔ ع

ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو، عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔ جسم قیدِ فرنگ میں۔ دل ترکوں میں اٹکا ہوا۔ جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور و دراز سے "اللہ اکبر" کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو، ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود، یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے۔ ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے۔ ؎

شیطانِ جلد باز کا جادو نہ چل سکا
تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا
اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر ترا یہاں بھی ہے تو ہو اسکے باب میں
کٹ ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی

تینوں حرم اسی کے جو ہے لاشریک لہ
ترکیب ہے درست ہی ایک تین کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑایا، اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رامپور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے، بڑھے تھے، کھیلے تھے۔ چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ کسی کو یہ مستقل جلا وطنی بھگتنی پڑے، جب قدر معلوم ہو۔ ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں۔ ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے
ہم نہ تھے ان کے آستانے کے

ایک اک کر کے سب کے سب تنکے
ہوئے برباد آشیانے کے

دیکھئے اب یہ گردش تقدیر
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی قید تنہائی! بیجاپور جیل کی کال کوٹھری کے اندر، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آ گئیں! سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا کیا کچھ دکھا دیا۔ راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان درود خوانی پر آئی تو کچھ الٹے پتے

اُس عالم کے بھی دیتی چلی گئی۔ ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگی اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے — ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے — ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں اس قید پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانے پر ہزاروں آبادیاں، مشتِ خاک کا شمار اب عالمِ پاک میں تھا، لوہا جب تپ کر، دہک کر لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہتا ہے۔ جو ہر اب عالم معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی رہ کہاں گئی تھی؟ ایک دیوانہ تھا، دیوانہ جیسے ایک دوسرے دیوانے سے، بلا کسی ظاہری ملاقات و تعارف کے خوب پہچانا، اور خوب ہی کہہ ڈالا۔ ؎

بدینِ مصطفےٰ دیوانہ بودی
فدائے ملتِ جانانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی
وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشقِ پاکت
ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
رمیدی از رہِ اغیار تا یار
عجب مستے عجب دیوانہ بودی

زبان پر آئی ہوئی 'واہ' کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل کی نکلی ہوئی 'آہ' کی رسائی مالکِ عرش تک! رومی اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی

روح بھی ہوتی تھی ؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہو گئے، محاورات بتدیل ہو گئے، ترکیبیں نئی ہو گئیں، لیکن حی و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہر لنے بھی اپنے کو اُسی نہ مٹنے والے زندہ کئے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، فنا کر دیا تھا، عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی اُن کے نصیب میں بھی آجائے!

بنیادِ تمدن

فرنگستان کے موجودہ سیاسی مفکرین میں ایک ممتاز نام آکسفرڈ کے جوزف ٹوینبی کا ہے۔ اجتماعی وتمدنی مباحث پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں، اور قوم ونسل کے علمی مسائل پر ایک ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس (اعیان واخلاقیات کی دائرۃ المعارف) کی ضخیم ومستند مجلدات میں عنوان "نسل" Race پر مبسوط مقالہ انھیں کے قلم سے ہے۔ مقالہ کے اندر ہر صاحبِ فکر کے لیے بہت سی بصیرتیں موجود ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں جب رومی یا لاطینی کلیسا نے مسیحیت کی منادی شروع کی، تو عالمِ انسانیت کو کل دو حصوں میں تقسیم کیا۔ مسیحی وغیر مسیحی۔ مسیحی تو وہ جو فی الواقع اور فی الحال مسیحی ہیں، اور غیر مسیحیوں کی تعبیر اس نے یوں کی کہ بالفعل نہ سہی، بالقوۃ تو یہ بھی مسیحی ہیں۔ یعنی گو اس وقت منکر ہیں، لیکن صلاحیت تو بہرحال ان سب میں قبولِ مسیحیت کی موجود ہے، اور تبلیغ کے اثر سے ان کا مسیحی ہو جانا دائرہ امکان میں ہے۔ ان کے اور مسیحیوں کے درمیان کوئی ابدی تفریق قائم نہیں، کوئی دائمی ولازوال حجاب نہیں۔ چنانچہ جو جو قومیں مسیحیت قبول کرتی گئیں اپنے پیش رو مسیحیوں کے معاشرتی واعتقادی زندگی اختیار کرتی گئیں، ان کے اور قدیم مسیحیوں کے درمیان کوئی اور فرق کسی قسم کا قائم نہ ہوا۔

ہوتے ہوتے، اصلاحِ کلیسا کا زمانہ آیا۔ قدیم کیتھولک مذہب اور پاپائے روم

کے خلاف بغاوت شروع ہوئی، اور مارٹن لوتھر کے اثر سے پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا۔ اب اہل یورپ کے فتوحات کا رقبہ وسیع ہوا، اور بحری ترقیوں کی بنا پر ایسی نئی نئی قوموں سے سابقہ پڑنا شروع ہوا، جو اپنی شکل و شمائل میں یورپ اور مغربی ایشیا کے باشندوں سے بالکل مختلف تھیں ان کی جلد کا رنگ یورپ والوں کے رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے تمدن و معاشرت کے ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ ہی یورپ میں نہ تھا۔ آب وہوا ان کے ملکوں کی یورپ کے ممالک سے بالکل مختلف تھی۔ یہ نیا تجربہ یورپ والوں کے لیے ایسا ہی تھا، جیسا اہل یونان کو اول اول اہل مصر سے سابقہ پڑنے پر پیش آیا تھا۔ لیکن یورپ کے دماغ نے اس سے جو اثر قبول کیا، وہ اس سے بالکل مختلف رہا، جو اہل یونان کے دماغ نے اپنے زمانے میں قبول کیا تھا۔

یونانیوں نے استدلال یوں کیا تھا، کہ باشندوں میں اگر اس قدر اختلاف ہے، تو خود ان ملکوں میں بھی تو اسی قدر اختلاف موجود ہے، اور اس لیے انسان کے ظواہر کا یہ سارا اختلاف نتیجہ ہے اختلاف ماحول کا، ورنہ حقیقت انسانی ہر جگہ یکساں ہے۔ جوں جوں ماحول میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اسی نسبت سے خواص بشری میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اور شدید سے شدید اختلافات کے عقب میں بہرحال ایک وحدت کا وجود ہے۔ اہل یورپ پر اس کے برعکس، اپنے نئے سابقہ والوں کی اجنبیت کا دھاکا ایسا بیٹھا، کہ اس کھلی ہوئی توجیہ، یعنی اختلاف ماحول کی طرف ان کا ذہن ہی نہ منتقل ہوا، نہ اس امر کی طرف کہ تمدن و معاشرت کے اختلاف کا ہر بڑے سے بڑا منظر بھی بہرحال تدریج ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پس ظواہر کے اختلافات سے وہ ایسا متحیر و مبہوت ہوئے کہ عوارض کو اصل قرار دے لیا، اور ظواہر کو حقیقت کی جگہ پر رکھدیا۔ ان کے ذہن میں صورت استدلال یوں آئی، کہ یہ تو ممکن ہے، حبشی مسیحی مذہب قبول کرے، لباس اور معاشرت بھی یورپی اختیار کرے لیکن اپنے رنگ کو کیا کرے گا، یہ تو بہرحال اس کے اختیار

کی چیز نہیں۔ گورا، زندگی بھر گورا ہی رہے گا، اور کالا مدۃ العمر کالا۔

یہ اختلاف رنگ کی اہمیت یوروپین دماغ پر اس درجہ مسلط ہوئی، کہ اس کا مطلق کوئی حل اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور رنگ کو گویا مستقل، نوعی، اختلاف کی بنیاد قرار دے کر اس نے انسانیت کی تقسیم مہذب و غیر مہذب دو حصوں میں کر دی۔ اب نئے نظریے کے مطابق، دنیا کی آبادی مسیحی و غیر مسیحی میں تقسیم نہ رہی، بلکہ اب دو صنفیں، گوری قوموں اور کالی قوموں کی قرار پاگئیں، جن میں سے ایک کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اپنے ارادے سے، اپنے اختیار سے، کام لے کر دوسری میں داخل ہو سکے۔ اس تقسیم کے بعد، خود یورپ کی ذہنیت بھی غیر متاثر نہ رہی۔ اور جس طرح یونانیوں کے اس نظریے کے بعد، کہ مصریوں کا مختلف تمدن مختلف احوال کا نتیجہ ہے، خود یونانیوں میں قومی عصبیت ہلکی پڑ گئی تھی، اور اس کی جگہ نرمی، فراخ دلی، اور رواداری زیادہ پیدا ہو گئی تھی، اسی طرح یورپ کی ذہنیت پر، اس گوری اور کالی انسانیت کی ناقابل اتصال و ناقابل التیام تفریق کا اثر یہ پڑا، کہ اس کی قومی اور نسلی عصبیت اور زیادہ گہری ہو گئی، اور غیر یورپی قوموں سے اختلاط کا امکان ہی جاتا رہا۔

یہاں تک مقالہ نگار کے مطالب اپنی زبان میں ادا کر دیے گئے، آگے جو کچھ آرہا ہے، اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ عبارت بھی حتی الامکان، مقالہ نگار ہی کی قائم رہے۔ ترجمہ، لفظی اب بھی نہ ہوگا، لیکن بہر حال ترجمہ ہوگا:۔

> "مسیحی دنیا ایک زمانے میں اپنے اندر جو اندرونی اتحاد، اور بیرونی قوتِ جاذبہ رکھتی تھی، اس کا صحیح اندازہ، موجودہ اسلامی دنیا سے موازنہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ (اسلام مسیحیت ہی کی ایک ادنیٰ درجہ کی نقل ہے، اور نشو و نما بھی جس کا بہت دیر میں ہوا) مغربی افریقہ ہو یا ہندوستان، مسیحی مبلغ سے بڑھ کر برابر عملی کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان مبلغ، نومسلموں کو حقیقتاً اپنے طبقہ میں شامل کر لیتا ہے، معاشرت میں ان سے برابری کا برتاؤ کرتا ہے، اور اپنی لڑکیوں کو انھیں بیاہ دیتا ہے۔ اس کے برعکس یورپی مبلغ، اسی تفریق رنگ کی بنا پر "دیسی" مسیحیوں سے ویسا ہی اجنبی و بیگانہ رہتا ہے، جیسا کہ غیر مسیحی کافروں سے۔ اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک "دیسی" کلیسا کا انتظام کر سکتا ہے یورپی آبادی سے بالکل خارج ہے"

یہ آخری خط کشیدہ فقرے خدا جانے ڈاکٹر امبیدکار اور دوسرے اچھوتوں کی نظر سے بھی کبھی گزرے ہیں، جو اپنی پستی اور ذلت کا احساس کر کے ایک نئے دین کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں۔ یاد رہے کہ ابتدائی غیر خط کشیدہ فقروں کی طرح، یہ عبارت ایک یورپی مسیحی کے قلم سے ہے جس کا رشتہ اسلام کے ساتھ دوستی کا نہیں، دشمنی کا ہے۔

اب آگے جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کے خوش ہونے کے لیے نہیں، عبرت و نصیحت حاصل کرنے، اور غور کرنے کے لیے ہے:-

"البتہ یہ ملحوظ رہے کہ جو مسلمان آبادیاں یورپی تمدن کی سطح کے قریب ترین آچکی ہیں، خود وہ بھی اپنی اسلامی (پان اسلامک) اخوت کو ختم کرتی جاتی ہیں، اور یورپین طرز کی وہ قومیت اختیار کرتی جاتی ہیں جس کی بنیاد وحدت لسانی پر ہے۔ چنانچہ شام کے عربوں میں اس جذبۂ قومیت کا حاصل یہ نکلا کہ اُن کے اور ایرانیوں اور ترکی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان مغائرت قائم ہو گئی، اور اس نقصان کی تلافی یوں ہوئی، کہ عربی زبان بولنے والے مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان مغائرت کا حجاب اٹھ گیا۔ ادھر عثمانی ترکوں میں[1] جو قومیت نمو پا رہی ہے، وہ خالص افتراقی قسم کی ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء سے قبل تک، سلطنت عثمانیہ میں،

---

[1] واضح رہے کہ مقالہ مصطفےٰ کمال کے دور سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے مسیحی ممالک کی طرح، برسرِ اقتدار وہ طبقہ تھا، جو اپنے میں بلحاظ حقوق، شمار و شامل اپنے ملک کے ان سارے لوگوں کو کر رہا تھا، جو اس کے ہم مذہب ہوں، خواہ یہ ہم مذہبی ارثاً حاصل ہوئی ہو، یا حال میں بذریعہ تبلیغ۔ نوجوان ترک پارٹی جب برسرِ اقتدار ہوئی، تو اس نے اس اخوت اسلامی کے بجائے 'عثمانیت' کا پروگرام پیش کیا۔ یعنی اشتراک کی بنیاد بجائے مذہب اسلام کے، ترکی زبان کو قرار دے دیا۔ اور عثمانی حدود ملک سے ان تمام لوگوں کو نکالنا شروع کر دیا، جن میں عثمانیت نہ طوعاً پیدا ہو سکی، نہ کرہاً۔ جنگ یورپ کے درمیان میں ٹرکی میں، جو نسلی مقدمات چلے، وہ جس طرح آرمینی مسیحیوں کے خلاف تھے اسی طرح عرب مسلمان کے خلاف بھی۔ اور گو آرمینیوں کو حسب دستور قدیم اب بھی اسلام قبول کرنے کا موقع دیا جاتا رہا۔ لیکن اب اسلام قبول کرنے کے بعد ہونے یہ لگا کہ اگر وہ عورتوں اور بچوں کے محض چند افراد ہوتے تو انہیں ترکی خاندانوں کے حوالے کر دیا جاتا، اور اگر پورے گاؤں یا قصبوں کی آبادیاں ہوتیں، تو ان کے ساتھ بھی، بس اسی سختی کا برتاؤ رہتا، جس طرح اسلام نہ قبول کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ پوری پوری آبادیاں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنی زبان قدیم قائم رکھیں، جیسا کہ بوسینا کے سلافی نسل والے، اپنی علیحدہ زبان، جب سے پندرھویں صدی میں سب کے سب مسلمان ہو گئے، اب تک رکھتے چلے آئے ہیں۔ وحدت دینی جو اشتراک معاشرتی کی بنیاد آبا و اجداد کے وقت سے چلی آتی تھی، اس سے نوجوان ترکوں کو کوئی غرض ہی نہ تھی، جبکہ وہ وحدت دینی، اختلاف ظاہر کو نہ مٹا سکے، جو جدید اور نازک قومی احساس کے لیے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

اس کے بعد مقالہ نگار آخر میں دو سوالات پیش کرتا ہے :-

"موجودہ احساس قومی کے اس تاریخی ارتقاء کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سب سے زیادہ ترقی پذیر مسلم آبادیوں نے آخر اس قومیت

کا اثر کیوں اتنا زیادہ قبول کر لیا ہے، جو حقیقتہً ایک تنزلی تحریک ہے؟ اور اگر اس کا سبب تقلید یورپ کو قرار دیا جائے، تو پھر یورپ، قرونِ مظلمہ سے لے کر اب تک کیسے ایسی مسلسل ترقی اس انحطاط انگیز تحریک کے باوجود کرتا چلا آ رہا ہے؟"

مقالہ نگار نے جواب جو کچھ دیا ہو، اس سے یہاں غرض نہیں۔ سوال تو آپ کے سوچنے کا ہے۔ کیا آپ کے قرآن نے آ کر آپ کو یہ پیام نہیں سنا دیا تھا کہ

یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ (نساء ع ۱)	اے انسانو! ڈرتے رہو اپنے پروردگار سے جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

اور جس نے پھر اسی حقیقت کو یوں ظاہر کیا تھا کہ

ھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ (انعام ع ۱۲)	وہ پروردگار رہی تو ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کر دیا ایک ہی شخص سے۔

اور پھر اسی پیام کو یوں یاد دلایا۔

ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ (اعراف ع ۲۴)	وہ خدا وہی ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کیا ایک ہی شخص سے

اور پھر فرمایا

خلقکم من نفس واحدۃ (زمر ع ۱)	پیدا کیا تم (سب) کو ایک ہی جان سے

اور کیا قرآن نے ایک آدھ بار نہیں، دس بیس بار یا ایہا الناس کا خطاب دوہرا کر یہ حقیقت خوب واضح نہیں کر دی ہے، کہ تمام نوعِ انسان، اصلاً ایک ہے۔ وحدتِ انسانی، اساسی و فطری ہے۔ جغرافی، لسانی، نسلی، کوئی، ساری تقسیمات محض فرعی و ذہنی ہیں۔ اچھے اور برے، کھرے اور کھوٹے، جو کچھ ہے، وہ عقائد و اعمال کی بنا پر، جو تمامتر اپنے اختیار و ارادے کی چیزیں ہیں، نہ کہ فلاں خاندان میں، فلاں سرزمین پر، فلاں ملک میں، پیدا ہو جانے کی بنا پر، جو انسان کے اندر اپنے ارادہ و اختیار سے تمامتر باہر ہے؟

اسلام کے قبل دنیا تو مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھی ہی، حد یہ ہے کہ دیوتا اور خدا تک ہر ہر شہر اور ضلع کے، دوسری جگہ سے الگ تھے۔ یہود جو موحد تھے، ان تک نے باوجود دعوے توحید کے، خدا کی خدائی کو صرف بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص کر لیا تھا، اور رب موسیٰ گویا صرف رب قوم موسیٰ تھا۔ یہ تخیل تو اسلام ہی نے آکر مٹایا۔ اسلام ہی نے رُب العالمین کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کیا، سب کو وحدت عقیدہ کی طرف بلایا۔ اور دنیا کی تقسیم صرف دو ہی حصوں میں رکھی۔ پیام کو قبول کرنے والے، اور نہ قبول کرنے والے۔

خدا کا غضب ہے کہ خود مسلمان ہی اس خدائی تفریق کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، اور اسکی جگہ پھر وہ مشرک قوموں والی، دورِ جاہلیت والی ذات پات والی، چھوت چھات والی تقسیم قائم کرنا چاہتے ہیں اپنا نذرانہ ناموں کی آڑ میں بڑے بڑے القاب کو سپر بنا کر، اور یہ بھی، اس وقت جب خود یورپ اپنی نکالی ہوئی راہ سے عاجز آچلا ہے، اور خود اپنے پیروں سے ان بیڑیوں کو کاٹنا چاہ رہا ہے۔ عملاً اسے اس پر قدرت ہو یا نہ ہو، یہ الگ سوال ہے، باقی اس کے سوچنے والے دماغ سوچ تو اب بھی رہے ہیں۔

خوش نصیب گول کیپر

تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد، سنہ غالباً ۱۹۰۰ء تھا، اور جاڑوں کا زمانہ، علیگڈھ کی فٹ بال ٹیم لکھنؤ میچ کھیلنے کو آئی ادھر علیگڈھ کے کھلاڑی گیند بلے میں اپنا سکہ جمائے ہوئے، ادھر لکھنؤ کی خلقت، کھیل تماشے کے شوق میں نام اچھالے ہوئے۔ شہر میں ایک دھوم مچ گئی، میچ کیننگ کالج گراونڈ پر تھا تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، امیر غریب جوان بوڑھے، طالبعلم اور سودے والے سبھی، اور اسی مجمع میں ان سطور کا راقم ایک اسکول کا گمنام طالبعلم بھی، علیگڈھ کے کھلنڈرے ایک سے ایک بڑھ کر، لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علیگڈھ کے گول کیپر پر جمی ہوئیں، ایک سرخ و سفید، قوی و تنو مند، خوش رو نوجوان پہاڑ کی طرح اٹل، اور چٹان کی طرح مضبوط، معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے فرائض کے لیے خلق ہوا ہے۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ پھر پھر کر کیسے کیسے حملے کرتی، اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام! بس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں! اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں! یہ تھا علیگڈھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شروانی خاندان کا چشم و چراغ "تصدق" کون کہہ سکتا تھا کہ اسے چند ہی روز بعد کھیل کود میں نہیں، فٹ بال فیلڈ کے سو پچاس گز کے محدود رقبہ کے اندر نہیں، سیاسیات و قومیات کی سنجیدہ اور خشک دنیا میں ہندوستان بھر کے

ماول و حریفِ رقیب میں۔ بڑی بڑی زبردست ٹیموں کے مقابلے میں۔ ملک و ملت کی
گول کیپری کے فرائض انجام دیتے ہوں گے!

سب سے پہلی زیارت یوں ہوئی کچھ ہی دنوں میں یہ سننے میں آیا کہ یہ
کھیل کا مردِ میدان، یونین کا وائس پریسیڈنٹ ہے اور اچھا جید مقرر بھی! یونین
کے وائس پریسیڈنٹ کے مرتبہ کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو علیگڈھ سے واقف ہیں۔
دل خوش ہو گیا کہ جو جسم کا دھنی تھا اس کا دماغ بھی کورا نہ نکلا! ... چار پانچ برس
کی درمیانی مدت چھوڑ جائیے ...... اب سنہ ۱۹۱۲ء آتا ہے اور اس کے دسمبر کا آخری
عشرہ لکھنؤ کی سرزمین رعشہ میں ہے، اور پرانے قومی لیڈروں کے قلوب لرزہ میں
ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی، ہر قومی ادارہ میں کامریڈ
اور الہلال معجزانہ تحریروں کے اثرات رونما ہو رہے ہیں، آزادی کی تحریک کا بگل
بج چکا ہے۔ "وفاداری حکومت" اور "مطالبہ حقوق" کے درمیان۔ پوری شد و مد کے
ساتھ پہلی بار طاقت آزمائی ہو رہی ہے۔ ایک طرف سب کے سب پرانے لیڈر ہیں
یعنی وہ آقا جن کی زبانیں اس وقت تک قانون کا حکم رکھتی ہیں، اور دوسری طرف
باغی، ابوالکلام اور شوریدہ سر محمد علی معہ اپنے چند نوعمر رفیقوں کے، ان گنے چنے چند
رفیقوں میں آپ کو باعتبارِ ظاہر جو سب سے زیادہ بلند نظر آ رہا ہے (اور بلحاظ باطن
بھی وہ کس سے کم ہے؟) وہ وہی پرانا گول کیپر ہے۔ تصدق احمد خاں شروانی، علیگڈھ کا
گریجویٹ اور لندن سے لوٹا ہوا تازہ وارد بیرسٹر!

آج سے محمد علیؒ جو تحریک اٹھاتے ہیں۔ چاہے وہ کالج اور یونیورسٹی کی اصلاح
کی ہو۔ یا جنگ بلقان کے چندے کی، یا قوم و ملت کی آزادی کی، تصدق شروانی،
سب میں سب سے پیش پیش شیرول جنرل کا ایک شیرول لفٹنٹ بنا، تاآنکہ
سنہ ۱۹۲۰ء کی وہ ہنگامہ خیز تحریک خلافت و ترک موالات شروع ہوتی ہے جس نے

سارے ملک کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا ڈالا! تصدق اس وقت تک ایک کامیاب بیرسٹر ہو چکے تھے، اور اپنے پیشہ میں نامور۔ گھر کے خوشحال پہلے ہی سے تھے اور اب تو خاصی عیش کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ قوم کے سرداروں کا حکم ہوا کہ بریکٹس چھوڑو، بڑھتی ہوئی آمدنی سے موالات ترک کرو۔ جو سر اس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے اُن سابق الاوّلون میں ایک یہ بھی تھے، غالباً ۲۲ء تھا کہ علیگڈھ میں عدالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا، شروانی ہنگامہ فرو کرنے گئے۔ پولیس اور مقامی حکام کو دل کے بخار نکالنے کا موقعہ ہاتھ لگا، دھر پکڑے گئے، اُلٹا الزام اشتعال انگیزی کا لگا گئے تھے آگ بجھانے مجرم آگ کے قرار پائے، اور وہ جس کا کام قصورواروں کا چھڑانا اور خطاکاروں کو رہائی دلانا تھا، اب خود بیجرم و بے خطا، قید فرنگ میں اسیر و محبوس تھا! سے قید اور پھر قید سخت، غالباً کچھ روز کے لیے قید تنہائی بھی۔ ایک رئیس اور رئیس کو بھلا اس سے مناسبت ہی کیا تھی؟ بڑی تکلیفوں کو چھوڑیے، تنگ و تاریک کوٹھری میں مچھروں ہی نے ایسا بھنبھوڑا کہ بے حال ہو گئے، اور بیمار بنکر نکلے! ماں باپ نے نام تصدیق رکھا تھا۔ کیا یہ نام ہی نام رہتا؟ اور عزت کی، آرام کی، مال کی، جان کی قربانی کچھ بھی نہ طلب کی جاتی؟

چھوٹے اور پھر پکڑے گئے، آزاد ہوئے اور پھر پکڑے گئے، وہ زندگی ہی کتنی تھی جو بے کرائے تھے، لیکن بہرحال جو کچھ بھی لکھا کر لائے تھے بس سب ہی الٹ پھیر میں گذاری! ابھی دیکھیے تو علیگڈھ میں ضلع کی عدالتوں میں ہیں الٰہ آباد میں صوبہ کی عدالت العالیہ کے نامور ایڈوکیٹ ہیں۔ اور دوسروں کی بگڑی ہوئی بنا رہے ہیں۔ موتی لال کے مشیر اور جواہر لال کے شریک و رفیق ہیں۔ کانگریس کو اپنے اشاروں پر چلا رہے ہیں۔ اور ابھی معلوم ہوا کہ لق و دق کوٹھی بھی سجائی موٹر کار نفیس مسہری اور دلکشا پائیں باغ سب چھوڑ چھاڑ اور اٹھائی گیروں کی

ہیں میلی کچیلی جانگھیا پہنے کھڑے ہوئے نقب زنوں اور گرہ کٹوں کی قطار میں بیٹھی گدڑی اوڑھے پیٹے جیل کی کھڑی زمین پر پڑے ہوئے ہیں بلند ہو اقبال سرکار نامدار کا! جوہر شناسی اسے کہتے ہیں! قدردانی اس کا نام ہے، ہندوستان کی سرزمین کو کبھی کیوں ایسی خوش مذاق نکتہ نواز، قدرشناس حکومت سے واسطہ پڑا ہوگا!

مرنے والا مر چکا۔ جینے والے اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزارہا روپے بے دریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے؟ ولایت اسی کی خاطر گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا، کوئی ہائیکورٹ کا جج۔ کوئی ہزاروں کما رہا تھا، کوئی ہزاروں لٹا رہا تھا۔ کوئی صوبہ کا منسٹر کوئی ایگزیکٹیو کونسلر، کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے اور یوں ہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟ اس کے پہلو میں دل کی جگہ کوئی لوہے کا ٹکڑا تھا؟ اس کے دل میں امنگیں باقی نہیں رہی تھیں؟ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا؟ کیا اس کی بیوی بچے، دوست، عزیز بھائی بند نہ تھے کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے سہنے دنیا کا جشن کرنے زندگی کے سکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا؟ تکلیف اس کے لیے تکلیف اور راحت اس کے لیے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟ ہو سکے تو سوچنے والے سوچیں!!

محمد علی جیل جا کر شاعر ہو جاتے تھے۔ سنہ ۲۱ تا ۲۳ء کی قید سے جب نکلے تو غزلوں کا ایک پشتارہ ساتھ لیے ہوئے، شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاعری میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے جیل جانے سے قبل مسلم یونیورسٹی

کے معاملات میں شروانی خاندان کے اکابر سے بہت کچھ رنج اٹھا چکے تھے۔ رہائی کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تو خوب اشعار سننے میں آئے ایک بڑی سی غزل اس زمین میں سنائی "بیابانیوں میں ہم پریشانیوں میں" ہم ایک "مشہور وفادار" بزرگ کی زبان سے فرمایا گیا تھا ؎

شرطِ وفا یہی ہے، تقاضائے دیں یہی
گڈفی کے ساتھ جا ملیں یونانیوں میں ہم

(کرنل گڈفی نے مسلمانوں کے "جیش انگورہ" کے مقابلے میں "جیش یونان" کی تحریک کی تھی) اور تو اور "بڑے بھیا" تک کو نہیں چھوڑا تھا ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں نہ گنیں اپنے کو روحانیوں میں ہم!

(خبر آئی تھی کہ مولانا شوکت علی راجکوٹ جیل میں رہ کر بہت لاغر ہو گئے ہیں)
ارشاد ہوا کہ مزے کا شعر "تصدق" کی زبان سے کہا ہے اسے ضرور سنو۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم!

شرافت کے امتحان کا اصلی وقت اختلاف و مخالفت کے موقع پر آتا ہے، یوں تو جب تک دوستی و یک دلی ہے، سبھی اچھے نظر آتے ہیں محمد علیؒ سے شروانی کا سیاسی اختلاف ۲۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ روز بروز بڑھتا گیا۔ ادھر آغاز ۲۸ء میں مولاناؒ کی مالی حالت اس درجہ ابتر ہو کر رہی کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صبح کی شام اور شام کی صبح کیونکر ہو گی مولانا کی لاعلمی میں دو چار نیاز مندوں نے سر جوڑ کر یہ طے کیا کہ مخصوص مخلصوں سے کچھ ماہوار رقمیں جمع کر لی جایا کریں نام پیش ہوئے محبت و عقیدت کے دم بھرنے والے بعض اچھے اچھے بزرگوار نکل گئے شروانی کے عزیز ترین دوست

ڈاکٹر سید محمود نے ان کا نام بھی رکھا تھا، میں کہتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ لیکن الٰہ آباد میں ایک بار جب جی کڑا کر کے تذکرہ کیا تو مرحوم نے اس فراخدلی اور خندہ جبینی کے ساتھ لبیک کہا، کہ مسرت کے ساتھ حیرت ہو کر رہ گئی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کا ذکر کر رہے ہیں! خیر وہ تجویز تو عمل میں کبھی بھی نہ آسکی (زیادہ تر مولانا ہی کے انکار و استغناء کی بنا پر) لیکن شروانی کی اس شرافت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور درجات بلند سے بلند تر کرے، خوبیاں بہت تھیں بہت تھیں اس محبت و اخلاص! اس ہمت و مردانگی، اس اخلاص و فراخدلی اس ذوقِ خدمت و تحمل مصائب کی مثالیں کمتر دیکھنے میں آئی ہیں ـــ جمعہ کے دن کی موت، عین نماز فجر کے وقت۔ ہر ایک کے نصیب میں آتی بھی تو نہیں ہے، اور پھر ہزارہا مسلمانوں کی دعائیں! خوش نصیب گول کیپر! دنیا اور آخرت، دونوں جگہ بازی لے گیا!

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

کی

نئی تصنیفات

رئیس الاحرار محمد علیؒ کے حالاتِ زندگی

محمد علی کی زندگی کے حالات دراصل ایک قوم اور ایک ملت کے حال و استقبال کی تفسیر ہے۔ محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا۔ اور نمایندہ بھی۔ اس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی کو محروم نہیں رہنا چاہیئے
قیمت دو روپیہ بارہ آنہ۔

مُردوں کی مسیحائی۔ از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ، جو سیرت طیبہ سے متعلق ہیں۔ پختہ ادیب کا قلم اور سیرت طیبہ کا موضوع۔ اس میں آپ وہ پائیں گے جو سیرت طیبہ کی ضخیم ضخیم کتابوں میں بھی نہیں مل سکتا۔ ادب، انشاء، رموز، نکات اور سبق، نادر و بیش بہا مجموعہ۔ قیمت صرف تین روپیہ چار آنہ۔

یقین و عمل۔ از عبدالقدوس ہاشمی، دنیا کی موجودہ بے چینی کا حل۔ صدر جمعیت فلاسفہ لندن کے افکار و خیالات۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ۔

25AUG60

ہماری مطبوعات

رئیس الاحرار محمد علی مرحوم ۔ از مولانا عبدالماجد دریا بادی۔
مولانا محمد علی کے حالاتِ زندگی دراصل ایک قوم اور ایک ملت کے
حال و مستقبل کی تفسیر ہے۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنے

مُردوں کی مسیحائی از مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی۔ مقالات
سیرت کا مجموعہ قیمت تین روپیہ چار آنے

یقین و عمل ۔ دنیا کی موجودہ بے چینی کا حل۔ صدر جمعیت فلاسفہ لندن
کے قلم سے۔ قیمت دو روپے چار آنے

محسوساتِ ماہر شاعر حیات ماہر القادری کا پہلا مجموعہ کلام۔
قیمت دو روپیہ بارہ آنے

نغماتِ ماہر ۔ شاعر حیات ماہر القادری کا دوسرا مجموعہ کلام قیمت تین روپے

رنگ محل ساغر نظامی کی نظموں اور غزلوں کا تازہ مجموعہ کلام۔
قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

ٹیگور اور ان کی شاعری ۔ از مخدوم محی الدین ایم اے (عہ)
جمہوریہ چین ۔ میر عابد علی خاں بی۔ اے (عثمانیہ) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
روحِ اقبال ۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں قیمت تین روپیہ بارہ آنے

(ہماری فہرست کتب طلب فرمائیے۔)